تزکیۂ نفس

•توقعات •تصورات •حمیت •حیا

باب چہارم

شعبہ خواتین

تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: A-67 علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور۔ 54000
فون: 36293939,36316638,36366638
ای میل: markaz@tanzeem.org www.tanzeem.org

فہرست

توقعات

تصورات

حمیت

حیا

باب چہارم

توقعات

تزکیے کے ضمن میں اب ہم ''توقعات'' "expectations" پر بات کریں گے۔
توقع کا تعلق دل سے ہوتا ہے، یہ دل کی ایک کیفیت کا نام ہے، اس کو امید (hope) بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ صحیح توقع کیا ہوتی ہے اور توقع کی غلط شکل کیا ہوتی ہے؟ کس سے توقع رکھنی چاہئے اور کس سے نہیں۔ اس لئے کہ توقع رکھنا یا نہ رکھنا زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ بعض اوقات خوشی اور سکون کا مدار بھی توقعات پر ہو جاتا ہے کیونکہ صحیح ہستی سے توقع رکھنا خوشی اور سکون کا باعث بنتا ہے اور غلط ہستی سے توقع رکھنا انسان کو پریشان (upset) کر دیتا ہے۔ تو ذہنی سکون کیلیئے، اچھی سیرت و کردار کے لئے اور اپنے تزکیے کیلیئے ہمیں اپنی توقعات کا مرکز جانچنا ہے۔

اپنے آپ سے توقع:

انسان کو خود سے یہ توقع رکھنی چاہئے کہ میں اپنے اندر بہتری لانے کے قابل ہوں۔
توقع کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیجئے، آلے (gadget) کے طور پر استعمال کیجئے اور اپنے آپ سے مبنی بر حقیقت توقع (realistic expectations) رکھیں۔ یعنی جن چیزوں کا اختیار آپ کے پاس نہیں ان کی توقع اپنے آپ سے مت رکھئے۔ کوئی ایسی چیز جو کہ آپ کے بس سے باہر ہے، پھر بھی اپنے آپ سے توقع کرنا کہ میں اس کو ٹھیک کرلوں گا یا کرلوں گی، یہ توقع لغو ہے اور نتیجے کے اعتبار سے تباہ کن ہے، ہوسکتا ہے یہ آپ کو کسی احساس کمتری (inferiority complex) میں مبتلا کرنے کا باعث بن جائے۔ اپنے اخلاق و کردار کو سنوارنا، اپنے کسی ہنر کو نکھارنا، اللہ کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں کو بہتر (improve) کرنا انسان کے اختیار اور بس میں ہے۔ اس کی توقع رکھنی چاہئے۔ اسی طرح اپنے آپ سے یہ توقع رکھیں کہ میں اپنی کوتاہیوں پر قابو

پانے کے قابل ہوں ، یہ اچھی توقع ہے، مثبت رویّہ (positive attitude) ہے۔ میں شریعت پر عمل کرنے کے قابل ہوں، میں جنت کے اعلیٰ درجات حاصل کرنے کے قابل ہوں، انسان اپنے آپ سے ایسی توقعات رکھے۔ جو اعلیٰ توقعات ہوتی ہیں وہ نیکی کے ارادے کو عمل میں ڈھالتی ہیں۔ اسی طرح لوگ بلندیوں کو حاصل کرنے والے(high achiever) بنتے ہیں۔ لہٰذا اپنے آپ سے اچھی توقع رکھنا اچھی بات ہے۔ اس کا اظہار ہمیں قرآن میں بھی ملتا ہے مثلاً سورۃ القصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول آیا ہے، انہوں نے توقع ظاہر کی تھی۔

﴿فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ﴾ (القصص: 17)

''کہ اب میں ہرگز بھی مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔''

اور سورۃ الصّٰفّٰت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے والدِ محترم حضرت ابراھیم علیہ السلام سے فرماتے ہیں:

﴿سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (102)

''اگر اللہ نے چاہا تو عنقریب آپ مجھ کو صابر پائیں گے۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے آپ سے توقع تھی کہ اللہ نے چاہا تو میں صابر رہوں گا۔ سورۂ کہف آیت ۶۹ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہمیں ملتا ہے انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا تھا۔

﴿سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا﴾

''بے شک آپ (انشاءاللہ) مجھ کو صابر پائیں گے۔''

اپنے آپ سے انہوں نے اچھی امید رکھی۔ غور کریں کہ خود سے اچھی اُمید رکھنے سے خود اعتمادی(confidence) پیدا ہوتی ہے، انسان اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے اور وہ کسی مفید کاموں میں لگتی ہیں۔ سورۂ یوسف میں بھی ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ملتا ہے۔

﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾

''کہ زمین کے خزانوں کا مجھ کو انچارج بنا دیجئے ، میں علم والا ہوں اور حفاظت کرنیوالا ہوں۔''

ان کو اپنے آپ سے یہ توقع تھی کہ اگر مجھے یہ ذمہ داری دی جائے تو میں اس ذمہ داری کو اچھی طرح ادا کرونگا۔

اچھی توقع کا فائدہ:

اس اچھی توقع کا سب سے بڑا فائدہ کیا ہوتا ہے؟ یہ انسان کو محنت پر آمادہ کرتی ہے، فائدے (incentive) کی امید دلاتی ہے۔ اور پھر وہ اس پر محنت کرنے کے لئے خوشی خوشی آمادہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ توقع رکھنا کہ اگر مجھے مال ملا تو میں اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا، یا موقع ملا تو شہادت کا درجہ حاصل کرونگا۔ اس توقع پر، اس ارادے پر بھی اجر ہے۔ نیکی کی نیت پر بھی نیکی لکھ دی جاتی ہے، خواہ عمل میں نہ آ سکے۔ مثلاً اگر شہادت کی تمنا اور نیت ہے تو بستر پر موت بھی شہادت میں شمار کی جائے گی۔ اور خود سے انسان توقع رکھے کہ اگر کہیں گناہ کرنے کا موقع بھی ملا تو مجھے توقع ہے کہ میں اس سے بچ نکلوں گا اور جب توقع رکھے یا کرے تو ''انشاءاللہ'' ضرور کہے۔

توقعات پر پورا اُترنے کے لئے ذہنی تیاری ضروری ہے:

اپنے آپ سے توقع رکھنا ایک طرح سے ذہنی مشق (mental exercise) ہے۔ انسان ذہنی طور اپنے آپ کو تیار کر رہا ہوتا ہے اور جب وہ ذہنی طور پر تیار رہوتا ہے اور پھر کوئی حقیقی صورتحال (real life situation) پیش آتی ہے، کوئی نیکی کا موقع ہاتھ آتا ہے یا انسان کسی آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے تو پھر وہ بوکھلاتا نہیں ہے، بلکہ پورے اعتماد سے کر گزرتا ہے، اس لئے کہ وہ ذہنی طور پر تیار رہوتا ہے، موقع سے فائدہ اٹھالیتا ہے۔ ورنہ اگر انسان ذہنی طور پر کسی کام کے لئے تیار نہ ہو تو موقع سامنے آنے پر وہ تذبذب (hesitation) کا شکار ہو جاتا ہے، گومگو کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اتنے میں وہ موقع (opportunity) کھو بیٹھتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ

توقع + موقع = کامیابی (expectation+opportunity=success)

تو انسان کو اپنے آپ سے اچھی امید رکھنی چاہئے۔ اپنے آپ کو خواہ مخواہ کم تر

(under estimate) نہ سمجھے، حقیقت سے قریب امید رکھے۔ اپنے آپ کو جانچے، پرکھے
کہ ہاں میں کیا کرسکتا ہوں، میرے اختیار میں کیا کیا ہے، کیا ممکن ہے۔

اللہ سے توقع:

اللہ سے توقع رکھنا بہت پسندیدہ ہے۔ اس کو قرآن میں ''توکل'' کہا گیا ہے۔ انسان کو اللہ سے توقعات رکھنی چاہئیں۔ بعض اوقات ہماری اپنی ذات ہماری توقع پر پوری نہیں اُترتی، لیکن جو توقعات انسان اللہ سے لگاتا ہے وہ لازماً پوری ہوتی ہیں بلکہ اللہ اُسکی توقعات سے بہت بڑھ کر دیتا ہے۔ اللہ سے خوب توقعات لگائے، اللہ کی اطاعت کرے، اس کے صلے میں توقع رکھے کہ مجھے اس کام کا اجر ملے گا۔ امتحانات، مشکلات اور آزمائش آنے پر توقع رکھے کہ اس کا صلہ مجھے اللہ دے گا، اجر ملے گا۔ جب مشکلات آئیں تو اللہ سے توقع رکھے کہ اللہ دُور کردے گا اور اللہ سے ضرور توقع رکھے کہ اللہ میری تمنائیں اور خواہشات ضرور پوری کرے گا۔ جب اللہ سے اتنی ساری امیدیں ہوتی ہیں تو اس کا مظہر دُعا کی شکل میں نکلتا ہے۔ انسان خوب خوب دعائیں مانگتا ہے اور اللہ سے اچھی توقع عین عبادت ہے۔ اور دعا تو ہے ہی عبادت، توقعات کا اظہار ہے دعا۔ جو کچھ اللہ سے امید (expect) کررہے ہوتے ہیں اس کا اظہار ہم دعا کی شکل میں کررہے ہوتے ہیں اللہ سے اچھی اچھی توقعات رکھنا انسان کو مایوسی سے بچالیتا ہے، پُر امید رکھتا ہے۔

﴿وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (یوسف: 87)

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ''اے میرے بیٹو! اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو اللہ کی رحمت سے تو صرف کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔''

تو اللہ سے کون توقع نہیں لگاتا جو کافر ہوتا ہے۔ مومن تو اپنے رب سے بہت توقعات رکھتا ہے اللہ یہ بھی دے گا، اللہ یہ بھی کریگا، اللہ سے تو مومن کی بڑی ہی امیدیں

(expectations) وابستہ ہوتی ہیں اور امید بھی رہتی ہے اس کو سورۃ الکھف آیت 16 میں اصحابِ کہف کا قول ہے۔

﴿فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا﴾ (الکھف:۱۶)

''چلو تم غار کی طرف، تمہارا رب تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے گا اور تمہارے معاملات میں آسانی پیدا کرے گا''

یہ اللہ سے امید تھی کہ اللہ کی خاطر ہم یہ کام کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ضرور ہماری مدد کرے گا۔ انسان کو یہ توقع پُر اُمید رکھتی ہے کہ ایک ذات ایسی اعلیٰ وارفع موجود ہے جو ہر شے پر قدرت رکھتی ہے، سب دیکھ رہی ہے وہ ہماری مدد و رہنمائی کرے گی۔ اس امید پر اس کے حواس بگڑتے (nerves shatter) نہیں ہیں، مشکل آنے پر مایوسی (depression) کا شکار نہیں ہوتا، اللہ کی ذات پر امید انسان کے اعصاب مضبوط (strong nerves) کر دیتی ہے، انسان کو ہمت اور اعتماد حاصل ہوتا ہے، کسی حال میں اس کا سر نہیں جھکتا، ہمت نہیں ہارتا اپنے رب کے ساتھ اس کا تعلق کبھی خراب نہیں ہوتا۔ صرف اس امید کی وجہ سے کہ میرا رب مجھ کو اچھا ہی دے گا۔ سورۂ مریم میں بھی ہمیں اللہ سے اس امید کا ذکر ملتا ہے جو بندہ اللہ سے لگائے رکھتا ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا۔

﴿عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا﴾ (مریم: ۴۸)

''مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہونگا''

اپنے رب کو پکار کر میں ناکام نہیں ہوسکتا، اتنی پختہ اُمید اور یقین تھا کہ اللہ ضرور میری دعا سنے گا اور میری مدد فرمائے گا۔ کوئی نقصان ہو جائے، کوئی مسئلہ پیش آجائے پھر توقع رکھنا کہ اللہ بہتری کرے گا اس کا ذکر ہمیں سورۂ قلم میں بھی ملتا ہے:

﴿عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ (۳۲)

''امید ہے ہمارا رب اس سے بہتر دے گا ہم اپنے رب سے زاری کرنے والے ہیں۔''

یہاں واقعہ کچھ یوں تھا کہ چند بھائی تھے جن کے بخل کی وجہ سے ان کا سارا باغ جل کر خاکستر ہو گیا۔ جب انہوں نے اپنے جلے ہوئے باغ کو دیکھا اتنا نقصان ہو گیا تو ان کی زبان پر یہ الفاظ آئے انہوں نے کہا:

﴿فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۔ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴾

(قلم: ۶۲،۷۲)

''جب انہوں نے باغ کو دیکھا تو کہا شاید ہم رستہ بھول گئے ہیں، (نہیں) بلکہ ہم محروم ہو گئے ہیں۔''

لیکن انہوں نے اس نقصان سے دل نہیں ہارا، اُمید قائم رکھی کہ اللہ ہی دینے والا ہے وہی لینے والا بھی ہے۔ جب ایسی سوچ ہو تو پھر نقصان بھی قابل برداشت بن جاتا ہے، شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوتی۔ انسان کبھی بھی پھر نقصان کے نتیجے میں ذہنی اور نفسیاتی مریض نہیں بنتا۔ بڑے سے بڑا نقصان بھی سہہ لیتا ہے کہ چلو اللہ مالک ہے وہ اور دے دیگا ہمیں اسی کے سامنے عاجزی ظاہر کرنی ہے اور اسی سے مانگنا ہے۔ پھر اور کوئی قدم اُٹھانا ہو، اللہ کی خاطر کسی نامعلوم (unknown) منزل کی طرف جانا ہو تو بھی اللہ سے اُمید رکھنی چاہئے۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول آتا ہے:

﴿وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ ﴾(۹۹)

''میں تو چل پڑا ہوں اپنے رب کی طرف عنقریب وہی مجھ کو ہدایت دے گا۔''

اللہ سے امید کہ اللہ کی خاطر نکلے ہیں تو اللہ کبھی رسوا نہیں کریگا، اللہ مجھے کبھی ناکام نہیں کرے گا اور اگر دنیا میں کوئی خطا ہو گئی ہے تو اللہ معاف کر دیگا۔ یہ امید استقامت دیتی ہے ورنہ اگر یہ امید نہ ہو کہ اللہ مجھے معاف کریگا تو نا اُمیدی انسان کو مزید اندھیروں میں دھکیل دیتی ہے۔ سورۃ الشعراء کی آیت ۵۱ میں یہ مضمون آتا ہے۔

﴿ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

''ہم کو اُمید ہے ہمارا رب ہماری خطائیں بخش دے گا کہ ہم پہلے مومن ہیں۔''

یہ اُن جادوگروں کا قول ہے جنھیں فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کے لیے بلائے تھے لیکن وہ جادوگر سمجھ گئے کہ جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام دکھارہے ہیں وہ محض جادو نہیں ہوسکتا اور ایمان لے آئے، اپنی پچھلی زندگی پر افسوس کیا اور انہوں نے اس اُمید کا اظہار کیا کہ اللہ ہماری وہ غلطیاں معاف کردے گا جو ہم سے ہوچکی ہیں۔

تو اللہ سے پُر اُمید رہنا انسان کو نا اُمیدی سے بچالیتا ہے اور اللہ سے تعلق بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔ ایسا تو کوئی اور رشتہ یا تعلق ہو ہی نہیں سکتا جیسا کہ خالق اور مخلوق کے درمیان ہوتا ہے۔ سورۂ طلاق میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ (طلاق :۰۳)

''اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کی کفایت کریگا، اللہ اس کو کافی ہوجائیگا۔''

وہ مسبب الاسباب ہے، وہ بغیر اسباب کے جو تم چاہو گے تم کو دے دیگا، وہ کسی کا محتاج نہیں اسباب اس کے محتاج ہیں تو خوب مانگو، خوب پکارو۔ سورۃ النساء آیت نمبر ۸۷ میں فرمان الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴾

''اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔''

اور ایک حدیث پاک میں ارشاد ہے:

((مَنْ لَمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ))[1]

''بے شک جس نے اللہ سے سوال نہ کیا وہ اس پر ناراض ہوگا۔''

اللہ سے نہ مانگنا، سوال نہ کرنا، دعا نہ کرنا، تکبر ہے جو اللہ کو بالکل پسند نہیں۔ اللہ کا وعدہ

(۱) ترمذی، کتاب الدعوات، باب منہ

ہے:

﴿ادْعُونِيٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (الزمر: ٦٠)

''مجھے پکارو میں تمہیں جواب دونگا، میں تمہاری سنوں گا۔''

ہمیں یقین کرنا ہے، بھروسہ کرنا ہے، وہ سنتا ہے اور حاجات پوری کرتا ہے۔ یہ اُمید یقین کے ساتھ قائم رہنی چاہئے۔ انسان مایوسی سے بچتا ہے، پُر امید رہتا ہے تو مظلومیت طاری نہیں ہوتی، خود پر ترس نہیں کھاتا (never allows self pity) مطمئن رہتا ہے، پُر سکون رہتا ہے، اللہ کی رضا میں راضی رہتا ہے اور نیکیوں پر عمل کرتے ہوئے ثابت قدم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ اس طرح ہمیں اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے آپ سے اچھی توقع رکھیں اور اللہ سے اپنی توقعات رکھیں۔

دوسروں سے توقعات:

دوسروں سے توقعات کو دو زمروں (categories) میں بانٹا جاسکتا ہے۔
(ا) اپنے فائدے کے لئے دوسروں سے توقعات لگانا۔ یہ تو محض اُداسی اور غم کا نسخہ ہے۔ مثلاً فلاں لوگ میرے لیے یہ کردینگے وہ کردینگے۔ یہ مجھے اچھا سمجھیں گے، میری تعریف کرینگے، مجھے یہ دینگے، مجھے وہ دینگے یہ توقعات انسان کو پریشان (upset) رکھتی ہیں، ان سے بچنے کی ضرورت ہے۔ (۲) دوسروں سے ان کے فائدے کے لیے توقعات لگانا۔ یعنی انسان کو اپنا فائدہ مطلوب نہیں ہے بلکہ ان کے فائدے کے لیے ان سے توقع لگا رہا ہے مثلاً وہ یہ کام کرینگے تو اس سے ان کو فائدہ ہوگا، دین کا پیغام ان تک پہنچا دینا کہ اگر قبول کرلیں تو ان کا فائدہ ہوگا۔ جیسے مائیں اپنے بچوں سے توقع رکھتی ہیں کہ وہ اپنی چیزیں اپنا بستہ، کپڑے یا کھلونے خود اپنی جگہ پر رکھیں گے۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر چیزیں ڈھونڈنی نہ پڑیں، وقت ضائع نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ تو اللہ کے لیے بندہ دوسروں سے توقع رکھے، اوروں سے اللہ کی بندگی اختیار کرنے کی توقع رکھیں۔ اس سے آخرت میں انہی کا اجر محفوظ ہوگا اور دنیا بھی سنور جائے گی۔ ایسی توقع رکھنا احسن ہے۔

دوسروں کی ہم سے توقعات:

پھر ایک توقع وہ ہوتی ہے جو دوسروں کو ہم سے ہوتی ہے۔اس حوالے سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے، یہ تھوڑا نازک معاملہ ہے۔ جب دوسرے ہم سے توقعات (expectation) لگاتے ہیں تو ان کا کس حد تک خیال رکھا جائے، کتنی اہمیت دی جائے۔اس معاملے میں ''شریعت'' اور ''فطرت'' دونوں انسان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ جہاں تک شریعت نے اجازت دی ہے وہاں دوسروں کی خواہشات کا احترام کیا جائے۔یعنی والدین،شوہر یا بیوی کی، اولاد، بھائی بہن یا دیگر قرابت داروں کی توقعات کی رعایت رکھنی چاہئے۔ کیونکہ دوسروں کی توقعات پر پورا اترنے سے تعلقات خوش گوار ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی غیر منطقی توقع ہے یا شریعت کے خلاف ہے تو یہ پوری نہیں کی جاسکتی۔سورۃ العنکبوت میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

(العنکبوت: ۰۸)

''تو والدین کی اطاعت کر لیکن اگر وہ یہ توقع رکھیں کہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرا تو ان کا کہنا نہ ماننا۔''

یہ توقع شریعت کے خلاف ہے۔شریعت کے خلاف توقعات تو پوری کی ہی نہیں جاسکتیں۔اس کے سوا جس حد تک استطاعت ہو، بس میں ہو، دوسروں کی جائز توقعات کو پورا کرنا نیکی ہے،اس کا اجر ہے، یہ احسان کا درجہ ہے۔ایک تو ہے لوگوں کا حق ادا کرنا یہ تو فرض کا درجہ ہے، یہ تو کرنا ہی کرنا ہے، نہیں ادا کرینگے تو گناہ گار ہوں گے۔اور دوسرا یہ کہ کسی حق سے بڑھ کر دینا، یہ توقعات (expectations) پر پورا اُترنا ہوا، اوروں کی توقعات پر پورا اُترنے والا محسن بن جاتا ہے۔یہ احسان کی روش انسانوں کے ساتھ اختیار کرنا چاہئے۔انسانوں کو حتی الامکان حق سے بڑھ کر دیں۔انشاءاللہ تعالی اس کا بہت اجر ملے گا۔

دوسروں سے کچھ کرنے کی توقع:

توقع کا ایک رخ یہ ہے کہ انسان کسی نیکی کے بدلے دوسروں سے توقع رکھے کہ وہ میرے لئے کچھ کریں گے۔ یعنی اگر انسان کسی کے ساتھ نیک سلوک کردے تو یہ توقع لگالے کہ اب وہ بدلے میں میرے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کام کرے گا یہ بھی ایک طرح کی فقیری ہے۔ دوسروں سے کچھ ملنے کے منتظر رہنا۔ دیکھیں، ہاتھ پھیلانے والا تو ہاتھ پھیلانے والا ہی ہے، چاہے وہ پیسے کے لئے ہاتھ پھیلائے یا کسی اور مدد کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں ایک قاعدہ دیا ہے کہ

((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى))[1]

''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔''

تو تم دینے والے بنو لینے والے نہ بنو، خود کو دوسروں کا محتاج مت کرو۔ دوسروں سے توقعات لگانے کا نقصان کیا ہوتا ہے۔ اب اس میں دو ہی احتمال ہیں، یا تو کوئی ہماری توقع پر پورا اُترے گا یا توقع پر پورا نہیں اترے گا۔ تیسری تو کوئی صورت ہے ہی نہیں۔ اِن دونوں صورتوں میں ہمارا ہی نقصان ہے، توقع پر پورا اُترتے ہیں تو بھی نقصان اور نہیں اُترتے تو بھی گھاٹا۔ وہ کس طرح سے؟ یوں کہ اگر ہم نے کسی سے توقع لگائی اور وہ پوری ہوگئی تو اُس کا احسان نہیں مانیں گے، قبول (acknowledge) نہیں کریں گے اور سراہیں گے نہیں، بلکہ سوچیں گے کہ ان کو تو ایسا ہی کرنا چاہئے تھا، ہم ان سے یہی اُمید (expect) لگائے ہوئے تھے۔ خاص طور پر ہمارے ہاں سسرالی رشتوں میں یہ چیز بہت پائی جاتی ہے۔ اگر ساس نے بہو سے توقع لگائی کہ وہ میرے ساتھ اچھا سلوک کرے گی، خدمت گزار ہوگی اور اگر وہ یہ کر دکھاتی ہے تو ساس کہتی ہے اس کو ایسا ہی کرنا چاہئے تھا، کونسا بڑا کام کیا۔ نہ اس کی تعریف کرے گی اور نہ اس کا احسان مانا جائے گا۔ تو فائدہ کیا ہوا! تعلقات بہتر تو نہ ہوئے۔

---

(۱) مسلم، کتاب الزکاۃ، باب بیان ان الید العلیا خیر ...

کچھ لوگ اپنی توقع کو دوسروں پر فرض کر دیتے ہیں، توقعات کو توقعات نہیں سمجھتے، اگلے کا احسان نہیں جانتے۔ سمجھتے ہیں یہ تو اس کا فرض تھا، اس کو یہی کرنا چاہئے تھا تو اس سے کوئی بہتری نہیں آتی۔ اور اگلے کے اوپر یہ چیز بوجھ بنتی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ اس نے تو اپنی طرف سے کوئی اضافی کام خوشی خوشی کیا تھا، اب تو وہ پچھتائے گا کہ لو یہ تو اب مجھ پر فرض ہی ہو گیا، یہ تو اب مجھ پر پابندی لگا دی کہ میں ایسا ہی کرتا رہوں۔ یہ بات تو سامنے والے کی پریشانی کا باعث بنتی ہے اور اگر پھر وہ ہماری توقعات پر پورے نہیں اُترتے تو شکایتیں اور بدمزگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ایک اور بات یاد رکھیں جب ہم کسی سے توقعات بڑھاتے ہیں تو وہ بھی ہم سے توقعات بڑھاتے ہیں۔ پھر وہ بھی صرف حق پر راضی نہیں رہتے۔ بلکہ اپنی بہت ساری خواہشات کو اپنا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی کے ہاں کوئی خوشی کی تقریب ہوئی اب توقع رکھی جاتی ہے کہ سب لوگ بخوشی مبارک باد دینے آئینگے، بعض دفعہ لوگ ڈر کی وجہ سے بھی آ جاتے ہیں، ان کا دل بالکل نہیں چاہ رہا ہوتا مگر ان کو پتہ ہوتا ہے کہ اگر نہیں گئے تو شامت آ جائیگی۔ بادِل نخواستہ چلے جاتے ہیں۔ اب جب اُن کے ہاں کوئی خوشی کی تقریب ہوگی اور کوئی اُن سے معذرت کر لے تو جواب ہوگا ہم بھی تو آپکے ہاں آئے تھے، آپ کیوں نہیں آئے؟ اس طرح ہم دوسروں سے توقعات بڑھا بڑھا کر اپنی زندگیاں بوجھل بنا دیتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی ہلکی رہے، کوئی ہم سے بہت امیدیں (expections) نہ لگائے تو پہلا کام یہ کریں کہ خود دوسروں سے توقعات وابستہ نہ کریں۔ کسی نے کوئی بھلائی کر دی تو اچھی بات ہے، نہیں کی تو کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ یہ رویّہ کہ میں نے فلاں کے ساتھ اتنا کیا، لیکن میرے مشکل وقت میں کسی نے ساتھ نہیں دیا، میں نے فلاں کا یہ کام کیا مگر اُس نے شکریہ کے دو بول بھی نہیں بولے۔ یہ اُمیدیں ہماری زندگی میں تلخیاں پیدا کرتی ہیں۔

رشتہ داروں کا خیال بلا توقع اللہ کے لئے رکھا جائے:

مفتی تقی عثمانی صاحب نے ''اصلاحی خطبات'' میں رشتہ داروں کے بارے میں لکھا ہے

کہ رشتہ داروں کا خیال محض اللہ کی خاطر رکھو۔ یہ سوچ کر اچھا سلوک مت کرو کہ یہ میرے گُن گائے گا یا میرا شکریہ ادا کریگا یا پھر میری تابعداری کریگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نیک عمل کرنے کے باوجود خوشی حاصل نہ ہوگی۔ اب اگر ہم بہوؤں کی بات کریں تو وہ بھی یہی چاہتی ہیں کہ ساس ہر جگہ ان کے گُن گائیں، قدم قدم پر شکریہ ادا کریں اور جب ایسا نہیں کیا جاتا تو ذمہ داریاں تو پھر بھی ادا کرنا پڑتی ہیں لیکن دلی آمادگی کے بغیر، مارے بندھے، جس سے کوئی خوشی نہیں ملتی۔ اس لئے کہ اپنے آپ کو بلاوجہ دوسروں کی تعریف کا محتاج بنایا۔ اگر محض اللہ کی خاطر کریں تو اللہ کے ہاں تو بلا حساب اجر ہے اور دنیا میں بھی بندہ خوش اور مطمئن رہے گا۔ ورنہ جل جل کر، کُڑھ کُڑھ کر، رو رو کر زندگی گزرے گی کہ ہمیں صلہ نہیں ملتا، بدلہ نہیں ملتا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک فقیر دوسرے فقیر سے کچھ مانگے۔ بھلا ایک فقیر کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ تو کیوں نہ بادشاہ سے مانگیں جو دینے والا ہے۔

ایک شخص کا واقعہ آتا ہے کہ کسی نے اس کو بتایا کہ فلاں بادشاہ بہت سخی ہے، ہر ایک کو نوازتا ہے، تمہاری حاجتیں بھی پوری کریگا، یہ سن کر وہ شخص بادشاہ کے پاس اپنی حاجتیں لیکر پہنچ گیا۔ جب وہاں گیا تو دیکھا کہ بادشاہ جائے نماز پر بیٹھا ہے اور ہاتھ پھیلا کر اللہ سے مانگ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ شخص دروازے ہی سے واپس آ گیا۔ اُس نے سوچا جب یہ خود کسی کے آگے ہاتھ پھیلا رہا ہے، خود کسی کا محتاج ہے تو میں کیوں اس سے مانگوں۔ میں اُسی سے کیوں نہ مانگوں جس سے یہ بادشاہ مانگ رہا ہے۔ کاش کہ ہم یہ نقطہ سمجھ لیں تو ہماری زندگیاں کتنی آسان ہو جائیں۔ اپنی ذمہ داریاں ادا کریں، لوگوں کے ساتھ احسان کریں، ان کی توقعات پر پورے اتریں لیکن محض اللہ کی رضا کی خاطر!

مفتی صاحب آگے لکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کی غلط فکر کی وجہ سے عربی زبان کی ایک مثل مشہور ہوگئی کہ رشتہ دار بچھو جیسے ہیں، ہر وقت ڈنگ مارنے کی فکر میں رہتے ہیں، کبھی راضی نہیں ہوتے۔ یہ مثل اس لیے مشہور ہوئی کہ رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک اس توقع کے ساتھ کیا گیا کہ ان کی طرف سے اچھا برتاؤ ہوگا۔ لیکن جب توقع کے مطابق حسنِ برتاؤ نہ ملا تو پھر وہ بچھو

ہو گئے، اب بُرے لگنے لگے۔ اسی طرح ساس سے یہی شکوہ رہتا ہے کہ وہ تو تعریف ہی نہیں کرتی، سسرال والے تو تعریف ہی نہیں کرتے، اگر کوئی بہو اپنی ساس یا نندوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے تو شوہر کو جا جا کر جتلاتی ہے تا کہ وہ تعریف کریں۔ اور اگر شوہر تعریف نہ کرے تو دل چھوٹا کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ یہ سراسر حماقت ہے، خواتین کو چاہئے کہ وہ اپنا وقار (dignity) قائم رکھیں۔

دنیا میں راحت سے رہنے کا ایک ہی نسخہ: مخلوق سے توقعات نہ رکھنا

دنیا میں راحت سے رہنے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی میں سکون (trinquility) ہو۔ یہ آزمایا ہوا نسخہ ہے کہ مخلوق سے توقعات ختم کر دیں۔ مثلاً فلاں شخص میرے کام آئے گا، میرے ساتھ اچھا کریگا، فلاں شخص میرے دُکھ درد، میری پریشانی و مشکل میں شریک ہوگا، میری مدد کریگا، صرف اللہ تبارک وتعالیٰ سے توقعات رکھیں۔ تو پھر اگر مخلوق کی طرف سے کوئی اچھائی ملے گی تو وہ خلافِ توقع ہوگی اور اس سے بہت خوشی ہوگی اس لیے کہ آپ توقع نہیں کر رہے تھے۔ اور اگر مخلوق کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے تو زیادہ رنج نہیں ہوگا اس لئے کہ اچھائی کی توقع تو پہلے بھی نہیں تھی، اس لئے صدمہ اور رنج زیادہ نہ ہوگا۔ ہم جو کہتے ہیں کہ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی، تم سے اس کی توقع نہیں تھی، تمہارے اس سلوک سے بہت دکھ ہوا، اس طرح کی باتیں کہنا چھوڑ دیں۔ اچھائی کی توقع کے بغیر جو خوشی مل جائے وہ اضافی (bonus) خیر ہے۔

والدین کی اولاد سے بے جا توقعات:

اسی طرح والدین بھی اولاد سے بہت زیادہ توقعات قائم کر لیتے ہیں اور پھر اپنے بچوں کی قدر نہیں کر پاتے۔ جو بچے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے پوری کر رہے ہوتے ہیں اُن سے بھی ناراض رہتے ہیں۔ کیونکہ اکثر لوگ غیر حقیقی توقعات لگا بیٹھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کی زندگی کا مرکز ومحور ہماری ذات بن جائے لیکن یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ ان کی اپنی

زندگیاں ہیں، اپنے مسائل، اخراجات، پریشانیاں، دوست احباب اور رشتہ داریاں ہیں تو ان سے اتنی توقعات لگانے سے کچھ فائدہ تو ہوتا نہیں، اُلٹا نقصان ہی ہوتا ہے کہ ماں باپ بچوں کی قدر نہیں کر پاتے۔ بچے جو بھی کریں والدین کو کم ہی لگتا ہے، توقعات کا اظہار شکایتوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ پژمردگی (depression) کا شکار ہو جاتے ہیں، بیمار پڑ جاتے ہیں۔

نہ شکریہ مانگو نہ شکایت کرو:

بعض لوگ اچھے گھروں میں رہ رہے ہوتے ہیں، اچھا کھانے کو ملتا ہے، معاشرے کے اندر عزت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیک بیوی دیا اچھا شوہر دیا یا پھر صالح اولاد دی مگر کسی نعمت کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ توقع کے مطابق نہیں ملا۔ کتنی ناشکری اور اپنے آپ کو اذیت دینے والی بات ہے۔ خود اپنی شخصیت کچل کر رکھ دیتے ہیں، خود کو دوسروں کا محتاج کرتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ فیصلہ کر لیں کہ ایک ہفتہ تک کوئی شکایت نہیں کرنی۔ نوکر نہیں آیا، پانی نہیں آیا، بجلی یا گیس ختم ہوگئی۔ ساس نے شکریہ نہیں کیا، نند نے گھر کے کام میں مدد نہیں کی، یہ سب شکایتیں ایک ہفتہ کے لیے چھوڑ دیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اللہ کی مدد سے توقعات سے چھٹکارا مل جائیگا۔ اپنی ذمہ داری اور فرائض پوری طرح ادا کریں۔ سستی کا مظاہرہ نہ کریں اگر شکریہ کے لئے فرائض اور ذمہ داریاں ادا کیں تو دنیا میں شکریہ کی صورت میں صلہ پالیا، پھر اللہ کے ہاں اجر نہیں ہوگا۔ قرآن میں آتا ہے کہ:

﴿اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا﴾

(الدھر: ۹)

”نیک لوگوں کا حال تو یہ ہوتا ہے ہم تو کھلاتے ہیں تم کو اللہ کی خاطر، ہم تم سے نہ بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر چاہتے ہیں۔“

ہم اپنی ذات کی بڑائی کے لئے نیک سلوک نہیں کرتے، ہم اللہ کی رضا اور خوشی حاصل کرنے کو یہ نیکیاں کرتے ہیں تو دوسروں کو شکریہ جزاک اللہ زیادہ سے زیادہ کیا کریں اور دوسروں کے احسانات کو یاد رکھیں۔

خواتین کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جب وہ رشتوں کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں تو کتنی پریشان ہوتی تھیں ۔اب اللہ نے شوہر دیا، اپنا گھر دیا تو شکر نہیں کرتیں، قدر نہیں کرتیں ۔اور ذرا سوچیں کہ جن چیزوں کی شکایت کرتی ہیں وہ کتنی بے ضرر ہوتی ہیں ۔کوئی ساس کوڑے لے کر مار پیٹ نہیں کرتی، نہ بھوکا پیاسا رکھتی ہے، نہ شوہر سے ملنے سے روکتی ہے، کوئی بھی ایسی نہیں، بس چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوک جھونک ہوتی ہے تو سوچیں اس سے بہتر نعم البدل(alternate) کیا تھا۔اگر آج تک گھر بیٹھی رہتی تو اچھا تھا؟ تو کیا وہ زندگی بہتر ہوتی؟ پُرسکون ہوتی؟ جب اللہ تعالیٰ نے ارمان پورے کر دیئے تو وہ کافی نہیں لگتا۔ اگلے گھر آتے ہی بہت سی توقعات لگا لیتی ہیں۔

جب احسانات کو یاد رکھتے ہیں تو دل کے اندر جگہ بنتی ہے۔اور اگر کدورت آ رہی ہے تو اس بندے کو چاہئے کہ جس سے گلہ شکوہ پیدا ہو رہا ہے اس کو تحفہ دیں، اس کے ساتھ وقت گزاریں۔ جب توقع پوری نہیں ہوتی تو ہم کھنچ جاتے ہیں، پیچھے ہٹ جاتے ہیں، اس سے دُوری پیدا ہو جاتی ہے۔تو آپ اپنی طرف سے اپنے مقام پر قائم رہیے، آپکو پیچھے ہٹنے کی ضرورت نہیں، بس احسان کی روش پر قائم رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''اللہ تو محبت کرتا ہے محسنوں سے''، جس سے اللہ محبت کر رہا ہے اس کو کسی کی محبت کا رونا رونے کی ضرورت نہیں۔

جن توقعات کو پورا کرنے کے نتیجے میں یعنی احسان کے نتیجے میں اللہ جنت جیسی نعمت دے رہا ہے تو پھر کسی اور سے کیا شکریہ چاہئے؟ کیا بدلہ مطلوب ہے؟ اور انسان یہ بھی یاد رکھے کہ کس کس موقع پر میں دوسروں کی توقعات پر پورا نہیں اُترا۔ہمیں یہ تو یاد ہی نہیں رہتا لیکن اگر دوسرے ممنون نہ ہوں تو ہماری انا پر چوٹ لگتی ہے یہ بھی بیمار انا کی نشانی ہے۔یاد رکھیں کہ میں کب کب لوگوں کی توقعات پر پورا نہیں اُترا۔ یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی انسان سب کی توقعات پر پورا اتر جائے، ماں باپ، بہن، بھائی، شوہر، سسرال، اولاد، انسان کے اندر کتنی کمی ہے یہ بات یاد رہے گی تو دوسروں کی کمزوری کا بھی احساس رہے گا۔اب توقعات بعض دفعہ بہت بڑھ جاتی ہیں۔ رشتہ جتنا قریبی ہوتا ہے توقعات اتنی ہی زیادہ ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ رشتہ بہت ہی قریبی ہو جائے مثلاً شوہر

بیوی کا، تو بیوی کی توقع ہوتی ہے کہ بغیر کہے شوہر جان لے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ کہنا کچھ نہیں بس ان کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ میں کیا چاہ رہی تھی یہ تو انتہائی غیر حقیقی توقع ہے۔ ہر شخص تو ایسا مزاج شناس نہیں ہوتا کہ چہرے کے تاثرات کو سمجھ جائے کہ دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے جیسے سر میں درد ہے منہ سے نہیں کہوں گی خود شوہر میری تکلیف کو سمجھ جائے اور دوائی لا دیں۔ پھر غصہ آتا ہی رہے گا، کسی کو میرا احساس نہیں، قدر نہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی غیر حقیقی توقعات ہیں جو لوگ رکھتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ

((لا تسئل الناس شيئا))[1]

''تم کسی سے کچھ نہ مانگنا''۔

ان صحابہ رضی اللہ عنہم کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اگر گھوڑے پر بیٹھے ہوئے ہاتھ سے کوڑا یا چابک گر جاتا تو اردگرد کھڑے لوگوں سے نہیں کہتے تھے بلکہ خود اُتر کر چابک اُٹھاتے تھے۔ خود ہی سارے کام کیا کرتے، اتنی بھی توقع نہ رکھی کہ اتنا چھوٹا کام بھی کسی سے کروالیں۔ تو حقیقت ہے کہ یہ خوش رہنے کا بہترین نسخہ ہے۔ اس میں انسان متحرک (active) رہتا ہے، ذہنی طور پر پُرسکون (relax) رہتا ہے، اپنے آپ کو مظلوم نہیں سمجھتا، اس کو پتہ ہوتا ہے کہ میرا رب سب دیکھ رہا ہے۔ ساری توقعات اللہ سے لگا لیجئے، اللہ آپ کو آپ کی توقعات سے بڑھ کر دے گا۔ اللہ سے آپ جو بھی توقع لگائیں گے وہ حقیقی (realistic) ہوں گی جب کہ انسانوں سے لگائی گئی توقعات بعض دفعہ غیر حقیقی ہو جاتی ہیں تو یہ تکلیف کا، صدمے کا سبب بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم دوسروں کی توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش کریں اور ہم دوسروں سے توقعات کم سے کم کر دیں۔ اللہ تعالی ہماری اصلاح فرمائے اور اللہ ہمیں خوش اور پُرسکون رہنے کا گُر سکھا دے اور وہ گُر یہ ہے کہ دوسروں سے توقعات نہ رکھی جائیں۔

---

(۱)سنن البیھقی الکبریٰ، کتاب الزکاۃ، باب الید العلیاء و الید السفلیٰ

تصورات

((اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِكَ مِنْ مُنْكِرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَھْوَاءِ وَالْاَدْوَاءِ))[1]

''اے اللہ! بے شک میں بُرے اخلاق، بُرے اعمال، بُری خواہشوں اور بُری بیماریوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

ہم توقعات پر بات کر چکے ہیں کہ اللہ سے جو توقعات لگائی جاتی ہیں ان کو ''توکّل'' کہتے ہیں۔ اللہ پر توکل کرنے کا اور اُس سے توقعات وابستہ کرنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ انسانوں سے توقعات رکھنے کے کیا فائدے اور نقصانات ہیں؟ ان پہلوؤں پر بات ہو چکی۔ توقع دراصل ہے کیا؟ انسان کا ایک خیال، ایک سوچ یا پھر ذہن کا ایک ''تصور''۔ قرآن حکیم میں لفظ ''تصور'' تو استعمال نہیں ہوا لیکن اس کے قریب تر معنی کا لفظ ''ظن'' قرآن میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی سوچنا (conjecture) اور تصور (imagine) کرنا۔ بالفاظِ دیگر کسی مجرد شے کو سوچنا ''تصورات'' کہلاتا ہے۔

ایسی چیزوں کے بارے میں سوچنا جس میں دین اور دنیا کی بہتری ہو۔ یہ تصور انسان کو فائدہ دیتا ہے، اس کا عمل بہتر بناتا ہے اور اس کی شخصیت بھی نکھرتی چلی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے ''تذلل'' پر بات کی تھی کہ اگر کوئی شخص تذلل کا شکار ہے اور اپنے اندر سے اس احساسِ کمتری کو دور کرنا چاہتا ہے تو اپنے اُس عیب پر توجہ دے جو احساسِ کمتری کا سبب بن رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسی خرابی یا کمی ہو جس کی وجہ سے وہ تذلل کا شکار ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی گناہ سے نہیں بچ پا رہا۔ اب سب سے پہلے تو وہ یہ تصور کرے کہ میں نے

---

(۱) سنن الترمذی، كِتَاب الدَّعَوَاتِ، بَاب دُعَاءِ أُمِّ سَلَمَةَ

اس گناہ کو ترک کر دیا ہے، اللہ کے فضل سے مجھے نجات مل گئی ہے۔ اور دوسری طرف اُس گناہ سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ تو جب یہ عیب نکل جائے گا تو تذلل بھی دُور ہو جائے گا۔ کسی بھی ارادے کی یا کسی بھی اچھے عمل کی ابتدا تصور سے کی جا سکتی ہے۔ اچھا ارادہ بھی تصور ہی ہے، ایک خیال ہے جو دماغ میں آیا۔ اس طرح تصور کی مدد سے تذلل دور ہو جائے گا۔ پھر اگر کسی شخص کا غصہ تیز ہے اور وہ اپنے غصے کی وجہ سے پریشان ہے، اس پر قابو پانا چاہتا ہے۔ غصہ اس کی شخصیت کو بدنما کر رہا ہے، عیب دار کر رہا ہے تو کیا کرے؟ تصور کرے کہ مجھے غصہ نہیں آتا، تصور میں لیکر آئے کہ میں ٹھنڈے مزاج کا ہوں اور ان حالات (situations) کا تجزیہ کرے جن میں اُسے غصہ آتا ہے۔ اور پھر تصور میں لائے کہ کوئی مجھے غصہ دلا رہا ہے، اور میں کس کس طرح اپنے غصے کو ضبط (control) کر رہا ہوں۔ اپنے تصور میں یہ مشق (practice) کرے کہ مجھے غصہ دلایا جا رہا ہے مگر میں خاموش ہوں، کوئی ردعمل نہیں دکھا رہا۔ میں نے کچھ عملی اقدامات کر لیے مثلاً پانی پیا، کھڑا ہوا تھا تو بیٹھ گیا، بیٹھا ہوا تھا تو لیٹ گیا، استغفار پڑھنے لگا، وضو کرنے چلا گیا۔ یہ سب سوچیں، یہ ذہنی مشق (rehearsal) ہے۔ یوں سمجھیں کہ تصور یا ظن خودکار تجویز (auto suggestion) کا کام کرتا ہے۔ اپنے آپ کو ہم خود تجویز (suggest) کر رہے ہوتے ہیں کہ اس طرح کے حالات میں ہمیں اس قسم کے رویّے کا اظہار کرنا چاہئے۔ تو جب ہم اس طرح اپنے تصور میں اپنی کمزوریوں سے لڑتے رہیں گے تو انشاءاللہ حقیقی زندگی میں بھی سرخرو ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر کسی کی آواز بہت اونچی ہے، بہت چیخ کر بولنے کی عادت ہے تو تصور کریں کہ آپ دھیمی آواز میں بات کر رہے ہیں۔ اپنے عزیز و اقارب سے، اپنے دوست احباب سے مناسب آواز میں محوِ گفتگو ہیں۔ لہٰذا جب حقیقی صورتِ حال (real life situation) پیش آئے گی تو اپنی کمزوریوں اور عیوب پر قابو پانا بہت آسان ہو جائے گا۔ ایک اور مثال دیکھیں کہ دو لوگ بیٹھے آپس میں کسی کی غیبت کر رہے ہیں اور آپ کو یہ غیبت بہت بُری لگ رہی ہے۔ کیونکہ اللہ نے اس سے منع کیا ہے۔ اب تصور کریں کہ میں گفتگو کا رُخ کس کس طرح بدل سکتا ہوں یا

بدل سکتی ہوں کہ لوگوں کی توجہ غیبت سے ہٹ جائے۔ تاکہ جب ایسی کوئی صورت حال سامنے آئے تو آپ ذہنی طور پر اس کا تدارک کرنے کے لیے تیار ہوں، اس کو سنبھالنے (handle) کی تیاری آپ پہلے سے کرچکی ہوں۔

یہ جو کامیاب بزنس مین ہوتے ہیں ان کے بارے میں سروے (survey) کیا گیا کہ جب انھیں کسی اہم اجلاس میں جانا ہوتا ہے تو یہ پہلے اپنے تیاری (home work) کے طور پر پوری میٹنگ کو ذہن میں لے آتے ہیں، اس کا ایک خاکہ تصور میں بنا لیتے ہیں، کون کون میز پر بیٹھا ہوگا، کس ترتیب (order) سے بیٹھے ہوں گے، کہاں کیا چیز پڑی ہوگی، میرے دائیں بائیں کون ہوں گے۔ پھر یہ پوری مشق کرتے ہیں کہ کیا کیا کہنا ہے، کیا کیا زیرِ بحث (discuss) لانا ہے، کیا باز پرس (inquiries) کرنی ہے، اس پورے منظر نامے کو تصور میں لے آتے ہیں۔ تو جب یہ لوگ اس طرح ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کرکے وہاں جاتے ہیں تو یقیناً تمام معاملات قابو (control) میں رہتے ہوں گے، ایسے موقعوں پر یہ لوگ دوسرے لوگوں کے متوقع روّیے کو بھانپ لیتے ہیں۔ اور کسی بھی طرح کی صورتحال سے نپٹنے کے لیے تیار ہوتے ہیں، یہ سب تیاریاں پہلے سے کرکے رکھتے ہیں۔ جو کامیاب کمانڈر ہوتا ہے وہ پہلے سے منصوبہ بندی کرکے جنگ میں جاتا ہے، اور تین چار قسم کے لائحہ عمل (strategies) پہلے سے تیار کرکے میدان میں اترتے ہیں۔ دشمن کی چالوں کا پہلے سے ہی حل نکال کر بوقت ضرورت اطلاق کرتے ہیں اور دشمن کو پسپا کردیتے ہیں۔

اللہ نے صرف انسانوں کے اندر قوتِ تصوّر رکھی ہے، یہ حیوانوں میں نہیں ہوتی۔ اس طریقے سے مختلف حالات میں مختلف قسم کی ہنگامی صورتِ حال (eventualities) سے نمٹنا مشکل نہیں ہوتا۔ انسانی فطرت میں تصوّر کی صلاحیت اللہ نے رکھی ہے اور قرآن کے تمام احکامات بھی انسانی فطرت کے مطابق ہیں۔ قرآن اپنے قاری کی قوتِ تخیل (Power of imagination) کو، قوتِ تصوّر کو بہت اُبھارتا (trigger) ہے۔ لفظوں میں تصاویر

(word pictures) کھینچی جاتی ہیں تا کہ ہمارا تصور (imagination) متحرک (activate) ہو جائے، ہمارا تصوّر زرخیز ہو جائے۔ قرآن میں کئی بار آتا ہے ﴿وَلَوْ تَرٰی﴾ ''کاش تم دیکھو''۔ ﴿وَمَآ اَدْرٰكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ﴾ ''تم نے کیا سوچا وہ بدلے کا دن کیا ہے''۔ ﴿ ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ﴾(الانفطار 18،17) پھر تم نے کیا سوچا وہ بدلے کا دن کیا ہے''۔ پھر قرآن کی مختلف سورتوں میں آخرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے مثلاً ''جب سورج لپیٹ دیا جائیگا، سوچیں ذرا وہ کیا منظر ہوگا؟'' آسمان کی طرف دیکھ کر تصور کریں کہ یہ وسیع وعریض آسمان کیسے پھٹے گا۔ سورج کیسے لپیٹا جائے گا، سورج جو اتنی قوت اور توانائی اور حرارت دے رہا ہے وہ کیسے لپیٹ دیا جائیگا، ان باتوں سے تذکیر حاصل کرنے کا ہمارے تصورات سے گہرا تعلق ہے۔ تصورات کا اثر عمل پر پڑتا ہے اور جب انسان قیامت کی تیاری کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو یہ تصورات مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم کا کیا نقشہ کھینچا ہے، ہماری تصور کی آنکھ کو روشن کیا گیا، اُجاگر کیا گیا، اور ہمیں سوچنے پر مجبور کیا گیا کہ یہ ہے جنت جو تمہارے لیے تیار کی گئی ہے۔ سو تیاری کرو، تا کہ اپنا ٹھکانہ اس پرسکون، پُرامن، خوبصورت، دلکش، دل نشین مقام پر بنالو۔ اگر کوشش کرو تو اس کو اپنا لو گے یہ تمہارے نام ہو جائے گا۔ سورۃ رحمٰن میں کیا خوب صورت نقشہ ہے۔

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (٤٦) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (٤٧) ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (٤٨)﴾ (رحمٰن)

''اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو باغ ہیں۔ تو تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی قسم قسم کے میووں کے درخت ہیں)۔''

یعنی دو باغ ہیں گھنیرے، سبز اور سایہ دار۔ ان آیات سے انسان کے ذہن میں ایک سکون (tranquility) کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ کون نہیں چاہے گا ایسی جگہ بسیرا کرنے کا! ہر

طرف پھل، پھول، نہریں، آبشاریں، گھنے گھنے، سایہ دار درخت، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ، سکون آرام، کوئی فکر، کوئی پریشانی نہیں، کھانا پینا با فراغت ہے۔ یہ سب تصور کر کے ایک سکون (relaxation) کا احساس ہوتا ہے۔ اور دیکھیں کہ تصور کیسے انسان کو پرسکون کرتا ہے اور ایسے ہی تصور کی طاقت بندے کو پریشان بھی کرتی ہے۔ جب جہنم کا نقشہ پیش ہوتا ہے۔ لوہے کے ہتھوڑے برسائے جائیں گے، کھولتا پانی ان کے اوپر انڈیلا جائے گا، ان کی کھالیں جب پک کر اتر جائینگی تو دوبارہ کھالیں اُگ آئیں گی تاکہ بار بار جلنے کا مزہ چکھیں۔ پینے کو کیا خوفناک چیزیں دی جائے گی، زقوم کھانے کو ملے گا، تصورِ عذاب ہی سے جھرجھری آتی ہے، ڈر لگتا ہے۔ انسان کی سوچ اور انسان کے تصورات انسان کی صحت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اچھی چیزیں سوچنے سے خوشی محسوس ہوتی ہے اور تکلیف دہ چیزیں سوچنے سے انسان افسردہ ہو جاتا ہے، انسان کو بیمار کر دیتے ہیں، محض تصور ہی سے یہ اثرات مرتب ہوتے ہیں تو یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ جسمانی اور ذہنی صحت کا بڑا گہرا تعلق ہمارے تصورات سے ہے۔ تصور میں یہ سب لائینگے تو تیاری بھی کریں گے اور اگر تصور میں نہیں لائینگے تو تیاری بھی نہیں کرینگے۔

تو یہ تصور بہت اچھی چیز ہے قرآن میں اس کے لیے ''ظن'' کا لفظ آیا ہے۔ پھر ''تذکر اور تفکر'' بھی دراصل تصورات ہی کی شکلیں ہیں۔ یہ سب تصورات کے اچھے استعمالات ہیں۔ دنیا میں جتنی بھی ایجادات ہوئیں ہیں ان کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ تصور ہی سے تو ہوئی! پہلے ذہن میں ایک خاکہ یا نقشہ بنتا ہے کہ یہ چیز یوں ہو سکتی ہے، پھر قدم بڑھاتے بڑھاتے، تصور کرتے کرتے، ایک نئی چیز وجود میں آجاتی ہے۔

تصور کا استعمال غلط ہو تو وہ نقصان دہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الکھف میں مضمون آتا ہے:

﴿وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا﴾

(الکھف: ۳٦)

''میں تو تصور نہیں کرسکتا کہ قیامت آئے گی اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا بھی جاؤں تو ضرور اس سے اچھی جگہ پاؤں گا۔''

جن چیزوں کے بارے میں یقینی خبر آچکی، ان پر یقین نہ کرنا اور اس کے برعکس یا مختلف تصور قائم کرلینا انسان کو شک میں مبتلا کردیتا ہے۔ حقیقت کے برخلاف اگر کوئی اپنی مرضی سے تصور قائم کرلیا تو یہ کیا ہوا؟ خود ہی سوچ لیا، کوئی ذہن میں خاکہ (image) بنالیا جو حقیقت سے بالکل مختلف ہے۔ تو ان دو چیزوں کا جب ٹکراؤ (clash) ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں شک (Doubt) جنم لیتا ہے۔ سورۂ جاثیہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَارَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ﴾ (۳۲)

''اور جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ بے شک حق ہے، (سچا ہے، حقیقت ہے) اور قیامت اس کے آنے میں تو کوئی شک نہیں'' تم نے کہا ''ہم نہیں تصور کرسکتے کہ یہ قیامت کیا ہوتی ہے گمان سا ہوتا ہے اور ہم یقین کرنے والے نہیں ہیں۔''

غور کریں کہ ان کو حق پر کیوں یقین نہ آیا؟ شک کی وجہ سے! تو انسان کو چاہئے کہ اپنے تصوّر کو قرآن کے تابع رکھے، اگر قرآن سے ہٹ کر کوئی تصور قائم کریں گے تو شک کا مرض جنم لے گا۔ غلط تصوّر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بغیر ثبوت (proof) کے دوسروں کے بارے میں کوئی تصور قائم کرلیا جائے۔ خود ہی سوچ لیا، خود ہی تصور گھڑ لیا، خود ہی اندازہ لگالیا تو یہ ظن اور گمان نقصان دہ ہوتا ہے۔ سورۃ الحجرات میں اللہ نے فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ (۱۲)

''اے لوگو۔ جو ایمان لائے ہو بہت گمان کرنے سے بچو۔ بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔''

اس آیت میں کون سے گمان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟ یعنی لوگوں کے بارے میں

سوچنا کہ وہ ایسا ہے، ویسا ہے۔ آگے فرمایا بعض گمان گناہ بن جاتے ہیں۔ یعنی ہر تصور کو منع نہیں کیا، بدگمانی کو منع کیا گیا ہے۔ بدگمانی بھی تصور کی ایک قسم ہے بغیر جواز کے کسی کے بارے میں تصور کر لینا کہ وہ میرا بُرا چاہتا ہے یا وہ میرا دشمن ہے۔ یہ چیز رویّے میں خرابی اور بگاڑ پیدا کرتی ہے، تعلقات میں کھچاؤ اور بگاڑ آ جاتا ہے۔ تو بلا ثبوت تصور کو بھی منع کیا گیا ہے۔

تصور انسان کو متحرک (motivate) بھی کرتا ہے۔ کوئی شخص مشکلات میں گھرا ہے یا کسی پریشانی کا شکار ہے اور وہ تصور کرے کہ ان مشکلات کا نتیجہ اچھا نکلے گا تو پھر وہ مشکلات ہلکی لگنے لگتی ہیں۔ لہٰذا اچھا گمان رکھیں، اچھا تصور کریں ورنہ اگر بُری بُری باتیں سوچتے رہیں گے تو خرابی ہی خرابی ہے۔ جو محنت کر رہا ہے، جو مشقت کر رہا ہے، جو پریشانی اُٹھا رہا ہے، اسے چاہئے کہ انجام کے بارے میں ضرور سوچے کہ اس کا انجام کتنا اچھا ہوگا۔ اس طرح بندہ مطمئن اور پُر امید رہتا ہے، کام میں لگا رہتا ہے۔ مثال کے طور کوئی بچہ امتحان کی تیاری میں کتنی مشکل اٹھا رہا ہوتا ہے، کھیل کود چھوڑ کر، دیگر مشغلے ترک کر کے، تیاری (preparation) میں مصروف ہے۔ یہ سب وہ اچھے نتیجے کیلیے برداشت کرتا ہے۔ اب اگر وہ تصور کرے کہ اتنی محنت کے باوجود اگر فیل ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اس طرح کا تصور اُس بچے کو پڑھائی سے دور کر دے گا۔

اُمید کیا ہے؟ یہ بھی تصور ہی ہے۔ مثلاً جب دو لوگوں کی شادی ہوتی ہے تو عام طور پر ایسے موقع پر اچھی اُمید رکھی جاتی ہے۔ کہ اب زوجین ایک نئی زندگی شروع کریں گے، اپنا گھر ہوگا، بچے ہوں گے وغیرہ۔ پھر ہم اس کے لیے بھرپور محنت اور کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر شادی سے پہلے ہی لڑکی سوچ لے کہ میری شادی کامیاب نہیں ہو سکے گی، مجھ سے میرے سسرال والے خوش نہیں رہیں گے، میرا شوہر مجھ سے محبت نہیں کریگا، میں اچھی بیوی نہیں بن سکتی۔ تو یہ نا اُمیدی اُس کی شادی کی ناکامی کی باعث بن جائے گی۔ تو بُرا تصور انتہائی حوصلہ شکن (demotivating) ہوتا ہے، یہ خود کو تکلیف پہنچانا ہے، اپنے آپ کو اذیت (torture) دینا ہے۔ اور اچھی اُمید رکھنا، اچھی سوچ رکھنا، اچھے تصورات رکھنا، انسان کو شاداب

(fresh) رکھتا ہے اور انسان سعیِ پیہم کرتا رہتا ہے، بڑی بڑی دشوار گھاٹیاں (rough patches) عبور کر لیتا ہے، اِس اُمید پر کہ انشاء اللہ بہتری ہوگی۔

تخیل:

حقائق پر مبنی چیزوں کے بارے میں سوچنا تصوّر کہلاتا ہے اور غیر حقیقی، غیر معقول چیزوں کے بارے میں سوچنا ''تخیل'' کہلاتا ہے۔ خوابوں خیالوں کی دنیا میں رہنا (flights of fancy)، عمل کا، محنت کا، کوئی ارادہ نہ ہو، نہ اپنے آپ کو متحرک (motivate) کرنے کا ارادہ ہو، صرف خیالوں ہی خیالوں میں زندگی گزار دینا، خیالی پلاؤ پکانا۔ بعض لوگوں کو اس تخیل کی ایسی چاٹ پڑ جاتی ہے کہ وہ فریب خیال (hallucination) میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں۔ یہ منشیات (drugs) بھی دراصل کیا کام کرتی ہے؟ انسان کو تخیل کی دنیا میں لے جاتی ہے، ٹھوس حقائق سے بالکل رشتہ کاٹ دیتی ہے۔ انسان کسی غیر حقیقی، غیر عقلی دنیا میں، خوابوں خیالوں کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے، "If wishes were horses, beggar would ride" یعنی اگر تخیلات سے کوئی بہتری ہوتی تو فقیر سب سے آگے ہوتے۔

یہ جو بچوں کی کہانیاں (fairy tales) ہوتی ہیں جن میں پریاں ہوتی ہیں، خوفناک دیو ہوتا ہے، یہ کہانیاں بچوں کو پریوں کے دیس میں لے جاتی ہیں۔ کیا پریوں کے دیس کا کہیں وجود ہے؟ کیا پریاں اصل میں کوئی مخلوق ہیں؟ نہیں! یہ صرف تخیل ہے، کوئی تصور نہیں۔ خوبصورت شہزادے (prince charming) کا تصوّر، سنڈریلا (cinderella) کا تصوّر، یہ سب تخیل ہے اور یہ انسان کی شخصیت پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ انسان کی قوتِ عمل کو شل اور بے حس کرنے والی چیز ہے۔ جبکہ ''تصوّر'' قوتِ عمل کو بڑھانے والی چیز ہے، عمل میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

تخیل انسانی ذہن کو مفلوج (paralysed) کر دیتا ہے، جیسے کہ شیخ چلی کی کہانیاں۔ جب شیخ چلی بازار میں مرغی کے انڈے بیچنے جا رہا تھا اور ایک منصوبہ (plan) بنا رہا

تھا کہ میں انڈے بیچ کر یہ خریدونگا، پھر وہ خریدونگا، یونہی کاروبار کرتے کرتے نواب اور امیر کبیر بن جاؤنگا لیکن چلتے چلتے ایک ٹھوکر لگی اور سارے انڈے گر کر ٹوٹ گئے اور سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ انہیں کہانیوں نے بچوں کو اس خیالی دنیا کا باسی بنادیا ہے۔ اب لڑکیوں کے دماغ میں اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر بھی ویسی ہی ہے، یعنی خوبصورت اور پُروجاہت،(tall and handsome) جسکا کہ حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے آج کل لڑکیوں کے لیے شوہر کا معیار صرف ظاہری شکل وصورت اور مال دولت رہ گیا ہے۔ متقی، نمازی یا شریف النفس انسان نہیں چاہئے۔ لڑکوں کو بھی فلموں اور کہانیوں والی شہزادیاں چاہئیں۔ لمبی، دبلی، گوری اور سانچوں میں ڈھلی ہوئی باربی(barbie) چاہئیں۔ اس تخیل کو اتنا زیادہ اُبھارا گیا ہے کہ لوگوں کا معیار ہی اس قسم کی لڑکیاں بن کر رہ گئی ہیں کہ لڑکی ہو تو ایسی ہو۔

اسلام ہمیں تخیلات سے نکال کر تصورات میں لے کر آتا ہے۔ حقیقی چیزوں کے بارے میں سوچو۔ خوابوں کی دنیا میں مت رہو۔ گناہوں کے خیال سے لذّت لینا بھی گناہ ہے، گناہ کر نہیں سکتے تو گناہ کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ مثلاً کسی نامحرم کا خیال ہمہ وقت دل میں پالنا، اس کے بارے میں سوچنا، زیادہ تر شاعری تخیل ہی تو ہے۔ سورۃ الشعراء آیت ۲۲۵ اور ۲۲۶ میں اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارے پھرتے ہیں اور کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں۔''

شاعر ہر وادی میں دیوانہ وار پھرتے ہیں، کبھی آسمانوں کی بات کریں گے تو کبھی زمین کی۔ ہر مصرعے میں مختلف داستان بیان ہوتی ہے، مختلف حالات کا ذکر ہوتا ہے، ایک انتہا (extreme) سے نکلیں گے تو دوسری انتہا(extreme) میں جا پہنچیں گے۔ اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ تو تخیل انسان کا کردار کمزور کر دیتا ہے لہٰذا اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ تخیل کی

انتہائی شکل یہ ہوتی ہے کہ باقاعدہ کچھ لوگ نظر آنے لگتے ہیں، یہ تو خیر بیماری (schezofrania) ہے، بندہ مجبور ہوتا ہے اس کا اپنا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا لیکن یہ بھی تخیل ہی کا بگاڑ ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دو چیزیں ہیں ''تصورات'' جو مثبت (positive) قوت ہے اور تخیلات جو کہ منفی (negative) چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں تصوّرات پر توجہ (focus) رکھنے کو کہا ہے۔ جنت کا تصوّر کرو، جہنم کا تصوّر کرو، قیامت کا تصور کرو۔ حشر کا میدان ذہن میں لاؤ۔ اپنے آپ کو بہتر بنانا چاہتے ہو تو پہلے اپنے آپ کو بہتر تصوّر کرو۔ تم مثبت سوچیں سوچو۔ اگر منفی سوچو گے، خراب تصورات ذہن میں لاؤ گے تو افسردہ (depress) ہو کر بے عمل ہو جاؤ گے۔ فطرت میں اللہ تعالیٰ نے تصوّر کی قوت اس لیے رکھی ہے کہ ہم ظاہر کو ہی سب کچھ نہ سمجھ بیٹھیں بلکہ اشیاء کی حقیقت تک پہنچ سکیں۔ اپنے تصور کا استعمال کر کے چیزوں کی حقیقت دیکھ لیں، اَن دیکھی چیزوں کو مان لیں، ہمارا ایمان تو ایمان بالغیب ہی ہے۔ حقیقت تو غیب کے پردے میں ہے، وہ تو اس دنیا سے تعلق ٹوٹنے کے بعد ظاہر ہو گی۔ ہم غیبی دنیا کا تجربہ اپنی آنکھوں سے تو نہیں کرتے، نہ سونگھتے ہیں، نہ چکھتے ہیں، نہ کسی اور طرح محسوس کرتے ہیں تو اگر ہمارے پاس قوتِ تصور نہ ہوتی تو ہم غیب پر کبھی ایمان نہ لا پاتے۔ تو تصور بہت مبارک چیز ہے۔

اَمَانی:

قرآن حکیم میں غلط تخیلات کیلیے ''اَمَانی'' کا لفظ آتا ہے۔ شیطان کہتا ہے میں لازماً انھیں جھوٹی آرزوئیں دلاؤں گا۔ جھوٹی آرزو تخیل ہی ہے۔ جھوٹی آرزو ہی نے تخیل کے ذریعے شرک کا چرچا دنیا میں کر دیا۔ انسانوں نے اپنے تخیل میں دیوی دیوتا گھڑ لئے۔ تو یہ انسان کو عقیدے کی خرابی کی طرف لے کر گیا اور عمل میں بھی خرابی کا باعث بنا۔

''توہمات'' (superstitions) دراصل تخیل کی ایک شاخ ہے جس کو ہم وہم ہو جانا کہتے ہیں۔ مثلاً اگر شیشہ ٹوٹ جائے تو سہاگ پر آنچ آنے والی ہے، ازدواجی زندگی پر اس

کا بُرا اثر پڑتا ہے یا کالی بلی راستہ کاٹ گئی تو پریشانی آنے والی ہے اور اگر سیڑھی کے نیچے سے گزر گئے تو بُرا شگون ہے۔ یہ سب ''توہمات'' ہیں یہ تخیل ہی کی پیداوار ہے اور یہ چیزیں پھر انسان کو بزدل بنادیتی ہیں، اللہ سے دُور کردیتی ہیں، عمل کے اندر شرک پیدا ہونے لگتا ہے۔ تخیل کا اور وہم کا علاج یہ ہے کہ شرک پر جو آیات آئی ہیں، اُن پر غور کیا جائے جتنی زیادہ اللہ کی معرفت حاصل ہوگی، جتنی اللہ سے قربت ہوگی، اتنا ہی ''تخیل'' اور ''وہم'' کا علاج ہوتا جائیگا۔ یہاں تک کہ تخیل اور وہم مٹ جائیگا اور اس کی جگہ صحیح چیز کا تصور دماغ میں آجائیگا۔ سوچوں سے اور خیالات ہی سے متعلق ایک چال ہے جو شیطان استعمال کرتا ہے اور وہ ہے ''وسوسہ''، (cumpulsive thought)۔ سورۃ الناس میں شیطان کا نام ہی ''وسواس'' آیا ہے، جس سے پناہ مانگی گئی ہے۔

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ (الناس:۴)

''جو پھسلائے بدی سے اور چھپ جائے۔''

شیطان بار بار آتا ہے، پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور انسانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ حدیثِ پاک میں مضمون آتا ہے کہ شیطان کی تھوتھنی جیسی ناک ہوتی ہے، جس طرح کسی کُتے کی یا اسی سے ملتے جلتے کسی اور جانور (dog family) کی ہوتی ہے۔ وہ انسان کے دل پر اپنی ناک رکھتا ہے، سونگھتا ہے، اگر وہ دل اللہ کے ذکر میں مصروف ہوتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اگر اللہ کے ذکر سے غافل پاتا ہے تو دل میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے، دل پر قابض (occupy) ہوجاتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے، شیطان انسان کے جسم میں ایسے گردش کرتا ہے جیسے خون گردش کرتا ہے، جس طرح دل جسم میں خون رواں کرتا ہے۔ اسی طرح شیطان کے وسوسے اور شیطانی خیالات بھی پورے جسم میں گردش کرتے ہیں۔ اور پھر شیطانی اعمال سرزد ہونے لگتے ہیں۔ اس وسوسے سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تزکیے کا ایک اہم ہدف دلوں کو وسوسوں سے بچانا ہے۔ اور اگر وسوسے سے پوری طرح بچانے پر ہم قادر نہ ہوں تو کم از کم اس پر عمل نہ کریں۔ جو فاسد خیال دل میں آیا ہو اس پر عمل نہ کریں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے

ہیں ''نبی اکرم ﷺ سے وسوسے کے بارے میں پوچھا گیا کہ دل میں کفراور شرک اور فسق فجور کے جو وسوسے آتے ہیں اُن کا کیا حکم ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا'' یہ وسوسے خالص ایمان کی علامت ہیں''۔آپ ﷺ کے اس قول سے کتنا اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ مومن کے لیے تو گناہ کا خیال وسوسے سے بڑھ کر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔جبکہ کافر یا منافق کا معاملہ یہ ہوتا ہے وہ تو اس خیال پر عمل کر جاتا ہے۔تو اگر کسی خیال کو وسوسے تک ہی محدود کر دیا، یہ ایمان کی وجہ سے کیا۔ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے یہ بات کہ میرے دل میں ایسے ا یسے وسوسے آتے ہیں کہ میں اُن کو زبان پر لانے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ میں جلا کر راکھ کر دیا جاؤں ۔تو میں کیا کروں''۔آپ ﷺ نے فرمایا'' یہ تو ایمان کی علامت ہے۔ایمان تھا تو تمہیں یہ خیال آیا کہ یہ غلط وسوسہ ہے۔اگر ایمان نہ ہوتا تو تم کو احساس بھی نہ ہو پاتا کہ یہ غلط خیال ہے اور دوسری بات یہ کہ چور وہیں پر آتے ہیں جہاں کوئی خزانہ ہو۔جس دل میں ایمان کی دولت ہے، وہیں شیطان ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، وسوسوں کے ذریعے سے۔یہ وسوسہ شیطان کا عمل ہے اور شیطان ایمان کا چور ہے۔اور وسوسے پر پریشان ہونا ایمان کی علامت ہے، ورنہ اگر کفر ہوتا تو بُرے خیالات پر پریشانی نہ ہوتی۔حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے شیطان کے مکر کو وسوسے کی حد تک محدود کر دیا۔کتنی پیاری بات ہے شیطان کی چال کو وسوسے کی حد تک محدود کر دیا، بس خیال تک محدود رہ گیا۔ایک اور حدیث میں آتا ہے'' اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دلوں میں پیدا ہونے والے وسوسوں سے درگزر فرمایا ہے۔'' گناہ کا وسوسہ دل میں آئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا، جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے۔گناہ کے خیال کا فوری توڑ یہ ہے کہ اللہ کی پناہ مانگ لی جائے۔

جیسے کہ یوسف علیہ السلام نے دعا کی تھی:

﴿وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ﴾ (۳۳)

''اللہ اگر تو نے مجھے ان عورتوں کی چالوں سے دُور نہ کیا، تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا، اور میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔''

تصوّر تخیل اور وسوسے میں فرق:

تصوّر تخیل اور وسوسے میں کیا فرق ہے؟ تصوّر اور تخیل میں انسان کی اپنی کوشش (effort) کا دخل ہوتا ہے۔ اپنے ارادے سے، اپنی کوشش سے وہ کوئی چیز سوچتا ہے۔ جبکہ وسوسہ میں اس کے اپنے ارادے اور کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ خود بخود ایک خیال دل میں آ جاتا ہے۔ بیٹھے بٹھائے اچانک کہیں سے ایک حملہ ہو جاتا ہے، جیسے ایکدم کوئی کیڑا کاٹ لیتا ہے بغیر اطلاع دیئے، بغیر محسوس ہوئے۔ اسی طرح یہ وسوسہ بے ضابطہ کہیں سے آ جاتا ہے اور جب آتا ہے تو اس کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اپنی طرف سے، سوچ کر، گناہ کا تصوّر قائم کرنا یا ارادہ کرنا۔ یہ شعوری عمل ہے، اس پر گناہ ہوگا، وسوسہ کا لفظ ہمیشہ بُرے مفہوم (sense) میں استعمال ہوتا ہے یعنی کسی نجس خیال کو وسوسہ کہتے ہیں۔

بدشگونی بھی دراصل وسوسہ ہی ہے وسوسہ دُور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔ اس کو دماغ میں جگہ مت دیں، فوراً اعوذ باللہ پڑھ لیں، زیادہ توجہ نہ دیں کیونکہ وسوسہ توجہ سے پلتا ہے، نشونما پاتا ہے، توجہ کا محتاج ہوتا ہے، توجہ نہ دی جائے تو محو ہو جاتا ہے، اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ اور اگر توجہ دی جائے تو پھر یہ پختہ (concrete) ہونے لگتا ہے، قدم جمانے لگتا ہے۔ شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ ہم وسوسوں پر توجہ (focus) دیں۔ اُس پر بات چیت کریں تا کہ وہ پختہ سے پختہ تر ہو جائے اور دوسروں تک بھی فاسد خیالات پہنچ جائیں۔ لہٰذا اس کو بالکل اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ کوئی برا خیال آئے تو اللہ کی پناہ طلب کریں۔ جتنا سوچیں گے، دوسروں سے (discuss) کرینگے، اتنا ہی ذہن میں پختہ ہوتا چلا جائیگا۔

ایک اور علاج یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی اور کام میں مصروف کر لیں اور اگر کسی چیز کے بارے میں وہم آ رہا ہے کہ یوں کرونگی تو یہ ہو جائیگا تو پھر وہ کام ضرور کیجئے تا کہ وہم نکل جائے اور معلوم ہو جائے کہ سب جھوٹ ہے۔ ایک خوبصورت دعا ہے، ''اے اللہ میرے دل میں آنے والے خیالات کو اپنی مشیت اور اپنے ذکر میں تبدیل فرما دے اور اے اللہ! میری فکروں کو، میری

پریشانیوں اور خواہشات کو ایسا بنادے جیسا تجھے پسند ہے اور جن سے تو راضی ہے۔''یعنی جو عمل میں کروں وہ تجھ کو راضی کرنے والا ہو۔ کیونکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان کی فکر، پریشانی اور خواہش بندے کو شیطان کے راستے پر لے جائے۔ یہ بہت ہی اچھی اور پیاری دعا ہے، انسان محتاط رہے، اللہ سے لو لگا کر رکھے، اور اللہ کی یاد کو دل میں رکھے تو انشاء اللہ تعالیٰ شیطان کا حملہ مؤثر نہ ہوگا۔ لیکن حملہ تو وہ ضرور کریگا۔ کبھی یہ مت سوچیں کہ ہم تو قرآن پڑھنے والے ہیں، ہم پر تو شیطان حملہ کر ہی نہیں سکتا، کسی وسوسے اور اندیشے کا ہم شکار ہو ہی نہیں سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو اللہ کے ذکر سے غافل ہے وہ تو شیطان کے لیے تر نوالہ ہے۔ اس کے اوپر تو کوئی خاص محنت کرنی ہی نہیں پڑتی۔ شیطان کی پریشانی کی باعث تو وہ بنتا ہے جو اللہ کے ذکر کیساتھ اپنے آپ کو جوڑ رہا ہے، جو اللہ کو بھولا بیٹھا ہے شیطان کو اس سے کوئی خطرہ نہیں، نہ وہ اس میں دلچسپی (interest) لیتا ہے، یہ تو خود شیطان ہی کا دوست ہے شیطان کو خطرہ مومن سے ہے، جو اللہ کی راہ میں چل پڑے اور اپنا تعلق قرآن سے جوڑے۔ شیطان سب سے شدت سے اُسی پر حملہ آور ہوتا ہے، اُسی کو بہکاتا اور ورغلاتا ہے، اللہ سے دُور کرنے کے لیے، اس پر محنت مشقت کرتا ہے، فکروں اور پریشانیوں میں مبتلا کرتا ہے، اس انسان سے ڈرتا ہے، تو وہ اُس کو اندر ہی اندر کمزور کرنا چاہتا ہے، اندیشوں اور وسوسوں کے ذریعے تو اندیشہ اور وسوسہ کو ایمان کی کمزوری ہرگز نہ سمجھیں۔ بلکہ یہ ایمان کی مضبوطی ہے، اپنے آپ کو مصروف کرلیں، اللہ سے اچھی اچھی اُمیدیں لگائیں، اچھی مثبت سوچ رکھیں، اور یہ سوچیں کہ یہ وہم، توہمات ہیں یہ اندیشے ہیں، ان سے کچھ نہیں ہوتا اللہ میری تقدیر میرے پیدا ہونے سے پہلے لکھ چکا ہے، مجھے کیا گھبراہٹ۔ اللہ پر توکل ہے، اللہ تو بہتر مولا، بہتر مددگار ہے، میں مومن ہوں مجھے کیا فکر۔ پھر وسوسوں کا، زندگی پر منفی (negative) اثر نہیں ہو پاتا۔ اس یقین کا زندگی پر (positive impact) ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے خیالات کا تجزیہ کرسکیں، اِن کا جائزہ لے سکیں، اور اللہ ہمارے خیالات کو پاکیزہ کردے۔ آمین ثم آمین!

حمیّت

((اَللّٰھُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰھَا وَزَکِّھَآ اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلٰھَا))[۱]

((اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنْ مُّنْکَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَھْوَآءِ وَالْاَدْوَآءِ))[۲]

((اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ الْھُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰی))[۳]

حمیّت (loyalty) کو عام الفاظ میں وفاداری کہا جاتا ہے،اردو زبان میں حمیّت کو غیرت بھی کہا جاتا ہے جو کہ ایک خوبی ہے،اچھا وصف ہے۔غیرت مند انسان نہ ہونا تو کوئی اچھی بات نہیں۔انسان کو اپنی ذات کے لئے غیّور ہونا چاہیے،اپنے خاندان کے لئے بھی غیرت ہونی چاہیئے کہ کوئی اس کے خاندان والوں کو بُرا بھلا نہ کہے، بلاوجہ ایذا اور تکلیف نہ پہنچائے، ملک اور قوم کے بارے میں بھی غیرت ہونی چاہیئے کہ ملک کی بدنامی نہ ہو، ہمارے ملک کو کوئی بُرا بھلا نہ کہے،تو یہ غیرت یا حمیّت بہت پسندیدہ چیز ہے۔

حمیت سب سے پہلے اللہ اور اس کے دین کے لئے:

انسان کو چاہیئے کہ اپنی زندگی میں ترجیحات (priorities) متعین کر لے کہ اُس کی زندگی میں اہم ترین چیز کیا ہے جس کے بارے میں حمیّت ہونی چاہیئے۔اور وہ ہے ''دین''۔اللہ تعالیٰ اور اُس کے دین کے لیے انسان میں سب سے زیادہ حمیّت ہونی چاہیئے، وفاداری

(۱)مسلم ،کِتَاب الذِّکْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ وَالِاسْتِغْفَارِ،بَاب التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عُمِلَ

(۲)سنن الترمذی،کِتَاب الدَّعَوَاتِ،بَاب دُعَاءِ أُمِّ سَلَمَةَ

(۳)مسلم ،کِتَاب الذِّکْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ وَالِاسْتِغْفَارِ،بَاب التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عُمِلَ

(loyalty) ہونی چاہیے۔ اللہ کے ساتھ لوگوں کی وفاداری دیکھ کر اور اُس کے احکام کی تکمیل کر کے اور اس کی محبت سے سرشار ہو کر خوشی کا احساس ہونا چاہیے۔

اس کے برعکس اللہ کی نافرمانی ہوتا دیکھ کر اور دین کے احکامات ٹوٹتے دیکھ کر انسان کے اندر شدید غصے اور غضب کے جذبات ابھرنے چاہئیں، اُس کی غیرت یہ دیکھ کر تلملا اُٹھے، دکھ، غم اور غصے کا احساس ہو۔ حدیث میں ایک واقعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی نسبت سے نقل ہوا ہے۔

((أَوْحَى اللهُ عَزَّ وَجَلَّ اِلَى جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنِ اقْلِبْ مَدِينَةَ كَذَا وَكَذَا بِأَهْلِهَا، قَالَ: فَقَالَ: يَا رَبِّ اِنَّ فِيهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ، قَالَ: فَقَالَ: اقْلِبْهَا عَلَيْهِمْ، فَاِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ))(۱)

''ایک دفعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فلاں بستی کو وہاں کے رہنے والوں سمیت اُلٹ دو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ 'اے اللہ اس بستی میں تیرا ایک بندہ ایسا بھی ہے جس نے کبھی زندگی میں پلک جھپکنے کی دیر تک (blink of an eye) بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُس پر بھی اُلٹو اور باقی بستی والوں پر بھی۔ کیونکہ میری اُس بستی میں میری نافرمانیاں ہوتی رہیں اور یہ سب دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ تک کبھی نہ بدلا، سب کچھ دیکھتا رہا لیکن اس کی تیوری پر بل نہ آیا۔ اس کی غیرت نے یہ سب گوارا کر لیا، اس کو اپنے رب کی نافرمانی دیکھ کر بُرا نہ لگا۔ یہ اپنی ہی نماز روزے میں مشغول رہا۔ اور دوسروں کے سدھار اور اصلاح کی فکر نہ کی۔ اس کو میرے احکامات علم تھا۔ لیکن یہ میرے احکامات کی پامالی خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہا۔ اس وجہ سے یہ تو اُن سب سے بڑا مجرم ہے۔''

ذاتی عبادات میں انسان مصروف ہو، فرائض ادا کرتا ہو لیکن دینی غیرت اور حمیّت کا

(۱) شعب الایمان، احادیث فی وجوب الامر و النهی عن المنکر علی من قدر علیهما بما قدر علیه

فقدان ہوتو ایسی عبادات اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہیں۔اس عبادت کے ہی نتیجے میں تو بندہ نہی عن المنکر کرتا ہے، معاشرے میں سدھار اور اصلاح کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔دوسروں کی آخرت کی فکر کرتا ہے۔یہی تو دینی حمیت ہے،اس کام میں اس کا کوئی ذاتی مفاد (cause) تو ہے نہیں۔یہ تو محض اللہ کی خاطر اور اُسکی رضا کے لئے،دین کی حفاظت کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔ اگر اذان ہوتی ہے اور کوئی نماز نہیں پڑھ رہا تو یہ آپ کا ذاتی معاملہ تو نہیں، آپ کا کیا بگڑتا ہے؟ پھر ہم کیوں دکھ اور تکلیف محسوس کرتے ہیں اور باقی لوگوں کو کہتے ہیں اُٹھو نماز ادا کرو۔صرف دین کی حمیّت کی وجہ سے! ہمیں دین کی بے وقعتی اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہے کہ یہ بندہ کیوں اللہ کی بات نہیں مانتا، اللہ کے حکم کو اتنا ہلکا کیوں سمجھ رہا ہے اُس کی نافرمانی ہمیں تکلیف دیتی ہے یہ دینی غیرت کا تقاضا ہے۔

جیسے اگر کسی مجلس محفل میں کوئی کسی کے والدین کا مذاق اڑائے تو وہ یہ برداشت نہیں کر سکے گا۔اگر بدلہ نہ بھی لے تو وہاں سے اُٹھ ضرور جائے گا، اپنی ناراضگی کا غم وغصہ کا اظہار ضرور کرے گا۔ یہ حمیّت کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ ہماری اپنوں سے وفاداریاں ہیں۔ ہماری غیرت یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ ہمارے والدین یا خاندان والوں کو کوئی بُرا بھلا کہے یا مذاق اڑائے۔ اس طرح دینی حمیّت کا تقاضا ہے کہ جہاں دین کا مذاق اڑایا جارہا ہو وہاں انسان نہ بیٹھے۔

سورۃ الانعام اور سورۃ المائدہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ:

﴿اِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ اِنَّكُمْ اِذًا مِثْلُهُمْ﴾(النساء: ۱۴۰)

”مت بیٹھو اُن لوگوں کے ساتھ جو دین کا مذاق اڑاتے ہیں۔اگر تم نے یہ کام کیا تو تم بھی انہی میں سے ہو جاؤ گے۔“

یہ ہے حمیّت جس کا تعلق اولین اللہ کے ساتھ ہونا چاہئے اور پھر درجہ بدرجہ اپنے مقام مرتبے کے لحاظ سے باقی سب معاملات کے لئے انسان میں حمیّت اور غیرت ہو۔

اگر حمیّت اللہ کے لئے نہیں ہے یا پھر اللہ کے لئے کم ہے، خاندان یا قبیلے کے لئے زیادہ ہے، ان سے وفاداری (loyalty) ان کی عزت کا احساس زیادہ ہے، بہ نسبت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی عزت کے تو ایسی حمیّت کو حمیّتِ جاہلیہ کہا جائے گا۔ سورۃ الفتح میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

﴿ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ﴾

(الفتح:26)

''اور جب بنادی اپنے دلوں میں ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا جاہلیت کی حمیّت۔''

تو یہ جاہلی حمیّت، خاندان، کنبے، قبیلے، رشتہ داروں کے ساتھ اندھی وفاداری، اُن کے بارے میں زیادہ احساس اور غیرت کا اظہار کرنا اور اللہ کے بارے میں بے نیاز ہو جانا، یہ چیز اللہ کو بالکل پسند نہیں ہے۔

اللہ کے سوا کسی کے ساتھ غیر مشروط وفاداری (unconditional loyalty) رکھنے کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ جب اللہ سے زیادہ دوسری چیزوں کے بارے میں حمیّت ہوگی تو اُن کی ہر بات ٹھیک لگے گی۔ کچھ بھی کریں، غلط کریں، صحیح کریں، الٹا کریں، سیدھا کریں، سیاہ کو سفید کہیں، دن کو رات کہیں، ہر چیز نبھائیں گے اور اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں گے۔ اس لئے کہ میرا خاندان ہے اور یہ میری حمیّت کا تقاضا ہے اور دین کی صحیح بات کو نہیں مانیں گے کیونکہ میرے خاندان والے نہیں مانتے۔ مشرکین مکہ سے جب کہا جاتا تھا ''آ جاؤ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف'' تو ان کا جواب ہوتا، ''کافی ہے ہمارے لئے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا''۔ یعنی وہ اپنی وفاداری کا مرکز اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو نہیں بناتے۔ یہ ہے حمیّتِ جاہلیہ، یہ پسندیدہ نہیں۔ تو جب ہم اسلام کے نور میں آ گئے ہیں تو ہمیں یہ بالکل زیب نہیں دیتا کہ کوئی بھی رسم، کوئی بھی طریقہ، کوئی بھی سوچ جو دورِ جاہلی کی پیداوار ہو، اُس کو اپنی زندگی میں شامل کریں۔ جب پہچان ہوگئی ہے تو نجات حاصل کرنے کا ارادہ کر لینا چاہئے۔

”حیا“(Modesty:)

حیا کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ” حیا فطرت کی محافظ ہے“۔ (Guardian of our nature) شریعت انسان کی عادتوں کو فطرت سے قریب کرنا چاہتی ہے اور شیطان چاہتا ہے کہ ہماری عادتوں کو جبلّت سے قریب کردے۔

حیا انسان کا خاصّہ:

حیا اُن انسانوں میں ہوتی ہے جو جبلّت سے بلند زندگی گزار رہے ہوتے ہیں چونکہ جانور صرف جبلّت کی سطح پر زندگی گزارتے ہیں اسی لیے جانوروں کے اندر حیا نہیں ہوتی۔شیطان کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ کسی طرح ہمیں جانوروں کی سطح پر لے آئے۔فطرت کے تقاضوں سے غافل کردے۔کسی طرح بہکائے اور واردات کرے۔تو اللہ نے ہمیں محتاط رہنے کی تاکید کی ہے، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾(النور: ۲۱)

”اے لوگوں جو ایمان لائے ہو شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی مت کرنا جو بھی شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کرے گا تو شیطان تو حکم دیتا ہے فحش کام اور بُرائی کا۔“

شیطان کا طریقہ واردات دو الفاظوں میں مضمر ہے، فحاشی اور منکرات۔ ان دو ہتھیاروں سے وہ انسانوں پر حملہ کرتا ہے اسی لیے اللہ نے ان دو حربوں سے ہمیں پہلے ہی خبردار کیا ہے۔سورۃ النحل میں آتا ہے:

﴿وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ﴾ (النحل : ۹۰)

”اللہ تعالیٰ روکتا ہے(منع کرتا ہے) فحش سے اور منکر سے اور زیادتی کرنے سے“۔

حیا انسان کی فطرت میں ہے:

حیا انسان کی فطرت میں موجود ہے یہ کوئی سکھانے والی چیز نہیں ہے بلکہ انسان یہ سیکھا

سکھایا پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھیں تو حیا کا تصور ہمیں اُن کی حیات مبارکہ میں بھی ملتا ہے۔ جب شیطان کے بہکانے میں آ کر حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا علیہا السلام نے وہ جنت کا پھل کھایا جس سے اللہ نے منع کیا تھا تو ان کے ستر کھل گئے اور انہوں نے فوراً اپنے آپ کو پتوں سے ڈھانپنے کی کوشش کی۔ کیونکہ ایک فطری جذبہ اُن کے اندر موجود تھا کہ یہ عریانیت (nakedness) اچھی شے نہیں ہے۔ غور کریں تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا، صرف اکیلے میاں بیوی تھے لیکن اُنہوں نے پھر بھی فوراً اپنے آپ کو ڈھانپنا شروع کر دیا۔

منکرات میں مبتلا ہونا:

شیطان کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ انسان کو براہِ راست فحش کاموں کا حکم نہیں دیتا۔ بلکہ وہ درجہ بدرجہ انسان کو فحش کاموں میں لگاتا ہے، منکرات کی طرف راغب کرتا ہے، منکر کا مطلب ہے بُرائی۔ اس میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن کے بُرے ہونے پر فطرت دلالت کرتی ہے، اُس کو پہچانتی ہے، جیسے جھوٹ، چوری وغیرہ۔ اور منکر کے اندر وہ بُرائیاں بھی شامل ہیں جن کا بُرا ہونا انسان خود سے نہیں جان سکتا۔ ایسی چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے بتا دیا ہے مثلاً سود، سور کا گوشت، رشوت وغیرہ۔ ''منکر'' دراصل وہ سب کام ہیں جو انسان کی شخصیت (human nature) کو مسخ (distort) کر دیتے ہیں جبکہ شریعت کا مقصد انسان کی فطرت کی حفاظت اور اُس کو خالص رکھنا ہے۔ اس لئے شریعت میں سود اور رشوت جیسی آمدن کے ذرائع پر پابندی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ ذرائع سے رزق حاصل کرنا ''منکر'' ہے اور یہ منکر انسان کو فحش کی طرف لے جاتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے نادانستگی میں خطا سرزد ہوئی تو سزا کے طور پر لباس اُتر گیا۔ لباس اترنے کا باعث کیا چیز بنی؟ حرام لقمہ! حرام نوالہ! اللہ کا منع کیا ہوا پھل! جتنا انسان حرام اور ناجائز کمائی میں ملوث ہوگا اُتنے ہی بے حیائی والے اعمال بڑھتے چلے جائیں گے اور اندر سے حیا ختم ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن نے ہمیں یہ سبق سکھا دیا کہ حیا چاہتے ہو تو سب سے پہلے حلال کماؤ اور حلال کھاؤ۔ اسی لئے سود کے بارے میں حدیث مبارکہ ہے:

((دِرْهَمٌ رِبًا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِينَ زَنْيَةً))(۱)

''سود کا ایک درہم لینا چھتیس دفعہ زنا کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے۔''

زنا کاری کا فحش ہونا تو ہم پر واضح ہے لیکن سود کھانا بے حیائی نہیں سمجھا جاتا۔ دراصل منکر میں پڑنا ہی انسان کو بے حیا بنا دیتا ہے۔ جب اللہ کا خوف نہ ہو آخرت کا ڈر نہ ہو، شریعت کی پرواہ نہ ہو، تو بندہ بے حیا ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسی طرح شراب کو حرام کیا اُس کی ایک وجہ یہ تھی اور ہے کہ یہ انسان کو اپنی حفاظت سے غافل کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو حفاظتی قوتیں رکھی ہیں، ایک ہے خوف اور دوسری ہے حیا۔ شراب ان دونوں جبلّی حسیات (instincts) کو دبا دیتی ہے۔ نشے کی حالت میں انسان ایسے ایسے بے حیائی کے کام کر جاتا ہے جو عام طور پر کبھی نہ کرے۔

''حیا'' اور ''حیات'' دونوں لفظوں کا مادہ (root) ایک ہی ہے۔ اگر حیا ہے تو حیات ہے اور اگر حیا مٹ جائے تو پھر معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی خطرے کا شکار ہو جاتی ہے۔

حیا کا روایتی تصور:

جب ہم حیا کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں حیا کا ایک روایتی سا تصور آتا ہے۔ ایک خاص قسم کی وضع قطع کو حیا سمجھا جاتا ہے اور حیا کو صرف عورت کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے کہ حیا تو بس عورت کو کرنی چاہئے حالانکہ ایک خاص وضع قطع اختیار کرنا اور عورت کا حیادار ہونا ''حیا'' کا حصّہ ہے مگر یہ کُل حیا نہیں ہے۔ دوسری طرف حیا کو کمزوری یا کم ہمتی یا اعتماد کی کمی (under confidence) کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا ہے کہ شاید تعلیم کی کمی کی وجہ سے حیا پیدا ہوتی ہے، یہ کسی کمزوری کی علامت ہے۔ یہ بھی ایک انتہا (extreme) ہے۔

دراصل حیا ایک پورا روّیہ (attitude) ہے، خالق اور مخلوق دونوں کے ساتھ درست رویّے کا نظام ہے۔ خالق کے ساتھ جب حیا ہوگی تو اللہ کے ساتھ ہمارا رویّہ درست رہے

(۱) مسند احمد ، مسند الانصار، حدیث عبداللہ بن حنظلة

گا اور مخلوق کے ساتھ بھی ہم حیا رکھیں گے تو یہاں بھی ہمارا رویہ درست رہے گا۔ حیا کی حیثیت انسان کے دماغ میں محافظ کی سی ہے۔ حیا انسان کی فطرت کی بھی محافظ ہے اور انسان کی عقل کی بھی محافظ ہے۔ جو خیالات آتے ہیں اُن کو حیا چھان (filter) دیتی ہے۔

حیا ایک پورے رویّے کا نام ہے:

ایک طرح سے یوں سمجھیں کہ حیا ایک چھلنی کی طرح ہے جس میں سے سوچ اور خیالات چھن کر نکلتے ہیں، بُرے خیالات چھوٹ جاتے ہیں، اچھے خیالات اور سوچ پروان چڑھتی ہے اور عمل میں نمودار ہوتے ہیں اور یہی تو تزکیہ ہے کہ انسان کے خیالات پاکیزہ ہو جائیں۔ تو پتہ چلا کہ تزکیہ حاصل کرنے کے لئے باحیا ہونا نہایت ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ سے حیا:

اللہ تعالیٰ سے درست تعلق کی بنیاد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ''الحیا'' اور ''الذُّلُ''، ''حیا کا ہونا'' اور ''عاجزی کا ہونا''۔ اگر انسان میں یہ دو خصوصیات ہیں تو اللہ سے اُس کا رویّہ درست ہو جائے گا۔ اللہ سب سے اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اُس سے حیا کی جائے۔ ترمذی میں حدیثِ مبارکہ ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اسْتَحْيُوا مِنْ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ))(۱)

''اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرو جیسی اُس سے حیا کرنی چاہیے۔''

مخاطبین نے عرض کیا الحمدللہ! ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''نہیں!''، یعنی حیا کا مفہوم اتنا محدود نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ بلکہ اللہ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ تم سر اور سر میں جو خیالات اُن سب کی نگرانی کرو اور پیٹ اور اُس کے متعلقات کی حفاظت کرو۔ یعنی دماغ کو فحش خیالات سے اور پیٹ کو حرام غذا سے بچاؤ۔ اور موت کے بعد قبر میں جو

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع، باب منه

حالت ہونی ہے اُس کو یاد کرو اور جو شخص آخرت کو اپنا مقصد بنائے گا وہ دنیا کی آرائش اور عشرت سے دستبردار ہو جائے گا اور اس چند روزہ زندگی کے عیش کے مقابلے میں آگے آنے والی زندگی کی کامیابی کو اپنے لئے پسند اور اختیار کرے گا۔ بس جس نے یہ کیا سمجھو اللہ سے حیا کرنے کا حق اُس نے ادا کر دیا۔

تو پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ سے بھی حیا ہوتی ہے۔ جب انسان تنہا ہوتا ہے اُس وقت بھی اللہ سے حیا کرنی چاہئے۔ اپنے خیالات کی نگرانی کرنی چاہئے۔ سوچ تو ایسی چیز ہے جو کسی کو سنائی نہیں دیتی، صرف ہم ہی جانتے ہیں کہ ہم کیا سوچ رہے ہیں۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ نے بھی ہمارا کیسا پردہ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے خیالات کو لوگوں کی نظروں سے اُوجھل کر دیا، یہ ہمارا پردہ ہے۔ لیکن یاد رکھیں کہ انسان کی سوچ اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے، اللہ سب جانتا ہے۔ ہمارے شعور میں اور ہمارے لاشعور میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ جانتا ہے۔ تو انسان اپنے خیالات کے بارے میں بھی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے۔ بُرے خیالات یا بُری سوچ آ جائے تو فوراً استغفار کرنا چاہئے۔

اللہ سے حیا کرنے کا ایک اظہار اس طرح بھی ہوگا کہ انسان کبھی تنہائی میں بھی بے لباس نہ ہو۔ خواہ کوئی نہیں دیکھ رہا لیکن اللہ تو موجود ہے، فرشتے تو ہیں۔ شیطان ہمیں وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے ہم اُس کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں کوئی شرعی ضرورت ہو تو اجازت ہے لیکن اُس وقت کی بھی مسنون دُعائیں ہیں جن کو پڑھنا چاہئے۔

والدین سے حیا:

اللہ کے بعد انسانوں میں سب سے بڑا حق والدین کا ہوتا ہے۔ تو والدین سے بھی حیا کرنی چاہئے۔ والدین سے حیا کا ایک بالکل غلط تصور رواج پا گیا ہے کہ بعض مسائل بچے والدین سے نہیں پوچھ پاتے، اس لیے کہ انہیں شرم آتی ہے۔ مثلاً بلوغت کے بعد جسمانی تبدیلیاں (physical and emotional changes) پیدا ہوتی ہیں۔ تو بچے اپنے ماں باپ

سے یہ بیان(discuss)ہی نہیں کر پاتے ، کہتے ہیں ہمیں شرم آتی ہے۔اس طرح کی شرم اچھی نہیں۔بعض دفعہ والدین بھی بچوں سے بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں، یہ شرم مناسب نہیں۔ والدین سے حیا اس بات میں ہونی چاہئے کہ وہ کام کرتے ہوئے شرم آئے جن سے والدین ناراض ہوتے ہوں یا اُن کی عزت پر حرف آئے۔یا انھیں شرمندگی اُٹھانی پڑے۔ پہلے زمانے میں بچے کوئی غلط کام کرتے تھے تو اُن سے کہا جاتا تھا کہ تم کو شرم آنی چاہئے !اور ماں باپ بچوں کو تاکید کرتے تھے کہ دیکھو کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ ہمیں شرمندگی اُٹھانی پڑے تو اُن کو ماں باپ کی عزت کا خیال رہتا تھا۔اس جملے سے بڑھ کر کوئی تنبیہ نہیں ہوتی تھی کہ تمھیں شرم نہیں آتی، یہ آخری (ultimate) ڈانٹ ہوتی تھی یعنی غلط کام کرنے پر بچے کو غلطی کا احساس دلایا جاتا تھا تاکہ شرمندگی(guilt) کا شعور جاگے۔یوں سمجھیں کہ خود بچے کو ایک طرح سے خود پر حاکم(judge) بنانے کی تربیت دی جاتی تھی کہ اُسے آئندہ کسی کے کہنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔وہ خود جانچ سکے،اچھا کیا ہے بُرا کیا ہے۔شعور بیدار کیا جاتا تھا تو شرم کی وجہ سے وہ اس غلطی کو درست کرتا تھا اپنے کئے پر شرمندہ ہوتا تھا اور آئندہ اپنی اُس غلطی سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔

موجودہ دور میں حیا کی جگہ بے حیائی نے لے لی:

بچے کو شرم کا احساس دِلا کر دو چیزیں دی جاتی ہیں۔ایک بہتری کی ترغیب دی جارہی ہوتی ہے اور دوسرے بچے کو خود اپنے بارے میں باشعور کیا جارہا ہوتا ہے تاکہ خود اپنے آپ کو (judge) کرلے۔ ہمارے بزرگوں کا یہی طریقہ تربیت تھا لیکن اب اس سے منع کیا جاتا ہے۔کہتے ہیں شرم وندامت(guilt & shame) کا کلچر نہیں ہونا چاہئے، جو بچے کرتے ہیں اُن کر کرنے دو۔اگر تم بچوں کو روکو گے تو ان کے اندر احساسِ جرم پیدا ہوگا،احساسِ کمتری پیدا ہوگی، ان کی شخصیت مسخ(distort) ہوجائے گی۔اب علمِ نفسیات(Psychology) نے اس پشیمانی اور شرم کو قابلِ مذمت عمل قرار دے دیا۔لہٰذا اب حیا شخصیت کی خوبی نہیں بلکہ شخصیت کا عیب بن گئی ہے۔ اور جن کے اندر حیا نہیں اُن لوگوں کو بہادر (bold) اور بااعتماد

(confident) سمجھا جانے لگا، اعتماد (confidence) اور سرکشی (defiance) کے مابین فرق نہ رہا، اب شیطان کو اور کیا چاہیے۔ جونہی فطرت کے محافظ کی چھٹی کی، شیطان تو پوری فوج لے کر حملہ آور ہو گیا، ہر طرح سے بے حیائی کو مزین کر دیا، خوبصورت بنا کر پیش کیا۔ ایک طرف برقی (electronic) اور مطبوعہ (print) میڈیا کی طرف سے ذہن سازی (brain washing) شروع ہو گئی۔ قلوب واذہان میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ حیا مردانگی کے خلاف ہے اور یہ تصور دیا گیا کہ جو مرد جتنا زیادہ نڈر اور بہادر ہو گا، اتنا ہی زیادہ بے حیا ہو گا۔ مثلاً یہ قانون نافذ کرنے والے سپاہی (law enforcement soldiers) جن کو عام طور پر بہادر سمجھا جاتا ہے وہ بغیر گالی کے بات ہی نہیں کرتے تو اس طرح رفتہ رفتہ حیا کا تصور مٹتا چلا گیا۔ شیطان نے بے حیائی کو بڑا خوبصورت بنا دیا۔

﴿وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ (انفال: ٤٨)

''اور جب شیطان نے اُن کے لئے اُن کے برے اعمال مزین کر دیئے۔''

اس طرح حیا کو مردوں میں سے ختم کر دیا گیا۔ آج اگر کسی لڑکے کو یہ کہہ دیا جائے کہ یہ شرمیلا ہے تو اُس کے لئے اس سے بڑی کوئی بے عزتی نہیں ہو سکتی۔ یا کسی لڑکے کو یہ کہہ دینا کہ بڑا شریف ہے تو اُس کی مردانگی پر بن آتی ہے۔ اب جب معاشرے میں ہم مردانگی کے اس مسخ شدہ معیار (distorted image) کو اپناتے ہیں اور اسی کو مردانگی سمجھنے لگتے ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ معاشرے میں فساد ہی مچے گا، بے راہ روی عام ہو گی، عزتیں کہاں محفوظ رہیں گی۔ بے حیائی کی وجہ سے زن و شو کے تعلق میں خرابی آ جاتی ہے اس لئے کہ مرد عورت کے تعلق میں جو پردہ ہے وہ تو حیا کا ہے۔ مرد اور عورت کا صحیح تعلق استوار ہو نہیں سکتا اگر اُن کے اندر حیا نہ ہو، جب حیا اُٹھ جائے گی تو تعلقات بگڑ جائیں گے۔

بچوں کو حیا کی راہ پر ڈالیں:

بچوں کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ آج نوجوانوں نے رول ماڈل (role

برے لوگوں کو بنایا ہوا ہے تو اس میں والدین کا بھی قصور ہے۔ والدین اُن کو صحیح رول (model) ماڈل (role model) نہ دے پائے۔ ایسے بھی لوگ دنیا میں گزرے ہیں جو انتہائی جری بہادر تھے۔ انتہائی کرشماتی (charismatic) تھے، دنیا کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا، جنگیں بھی لڑتے تھے اور ساتھ ساتھ انتہائی باحیا بھی تھے، نظریں نیچی رکھنے والے تھے۔ اپنی عزت کی حفاظت کرنے والے تھے، زنا سے بچنے والے تھے، زنا کو بہت بُرا اور گناہ سمجھتے تھے۔ اسکی مذمت (condemn) کرتے تھے۔ تو ہم اپنے بچوں کو کیوں نہ ایسی شخصیات یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بتائیں۔ اپنے بچوں کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کے بارے میں لکھی گئی کتابوں سے متعارف کرائیں۔ تاکہ بجائے اِدھر اُدھر کی کہانیوں کے ان اعلیٰ ترین لوگوں کے بارے میں پڑھیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتائیں تاکہ ان کے کردار کی تعمیر اسی طرز پر ہو کہ یہ لوگ کیسے بہادر اور باحیا تھے، کیا زبردست لوگ تھے۔

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ:

((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا))[1]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیر شادی شدہ لڑکی سے زیادہ حیادار تھے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر اتنی شرم اور حیا تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ساتھیوں میں بھی یہ خوبی پائی جاتی تھی، مکمل ستر ڈھانپنے والا لباس پہنتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی زندہ یا مردہ انسان کی ران (thigh) پر نظر ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔ اسلام میں اتنی حیا ہے کہ جب مردے کو بھی نہلایا جاتا ہے تو اُس کے پردے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ موٹی چادر اوپر ڈالی جاتی ہے اور چادر کے نیچے سے نہلایا جاتا ہے تاکہ جسم نہ کھلے۔ تو مردے کی ران پر بھی نظر ڈالنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

(۱) بخاری، کتاب الأدب، باب الحياء

کجا یہ کہ مرد عورتیں، لڑکے لڑکیاں نیم عریاں حالت میں بازاروں میں گھومیں پھریں۔

حیا بہادری و مردانگی دکھانے میں رکاوٹ نہیں:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان تعلیمات پر عمل کیا لیکن یہ تعلیمات قیادت وسیادت میں حائل نہیں ہوئیں، حیا رکاوٹ (impediment) نہیں بنی، بہادری، مردانگی کی راہ میں جنگیں لڑیں اور جیتیں، دشمنوں اور اسلام کے مخالفین کے چھکے چھڑا دیئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کھیل بھی کھیلے، تیراکی بھی کی اور فاتحین دو عالم بھی قرار پائے لیکن ستر کبھی نہ کھلے۔ تو زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے لئے یا ترقی کے لئے ستر کا کھلنا کوئی شرط نہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بہت زیادہ حیادار تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ((أَصْدَقُهُمْ حَيَاءً عُثمان رضی اللہ عنہ)) (۱) ''سب سے زیادہ حیا کرنے والے عثمان رضی اللہ عنہ ہیں''۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ حیا صرف عورت کے لئے ضروری ہے اور مرد کے لیے ضروری نہیں۔ مرد کے لئے بھی حیا اتنی ہی ضروری ہے جتنی عورت کے لئے ضروری ہے۔

لڑکے کیا، لڑکیاں بھی حیا کھو بیٹھیں:

جب ہم فطرت سے دُور ہٹے تو بیٹوں کو باحیا بنانے کی بجائے اپنی بیٹیوں کو بھی حیا سے محروم کر دیا۔ ہم نے کہا کہ ہم اپنے بچوں میں برابری (equality) کریں گے۔ چلیں برابری (equality) بھی کرنی ہی تھی تو لڑکوں میں حیا کی صفت اور خوبی پیدا کرتے، لیکن ہم نے ظلم یہ کیا کہ بیٹے تو حیا سے عاری تھے ہی، بیٹیوں کو بھی حیا کے زیور سے محروم کر دیا۔ اب لڑکیاں بھی شرم وحیا کو اچھا نہیں سمجھتیں۔ بے حیائی (immodest) کو وہ بھی اعتماد (confidence) اور بہادری (bold) سمجھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے حیا کا تصور قرآن سے سیکھا ہی نہیں۔

---

(۱) ترمذی، کتاب المناقب، مناقب معاذ بن جبل وزید بن ثابت

حیا کی زندگی:

نہ ہم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو سامنے رکھا نہ ازواجِ مطہرات کو، نہ صحابیات رضی اللہ عنہن کو نہ قرآن کی تعلیمات کو ماڈل بنایا۔ کاش ہماری زندگی میں قرآن کا نور ہوتا تو ہمیں حضرت مریم علیہا السلام کا کردار نظر آتا کہ باحیا لڑکی کیسی ہوتی ہے، کیسی باوقار (dignified) ہوتی ہے، کیسی پُراعتماد ہوتی ہے۔ وقت پڑے تو پورے اعتماد سے مردوں سے بات کرتی ہے۔ اور کاش ہم نے قرآن سمجھا ہوتا تو پتہ چلتا کہ گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کی ضرورت پیش آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہونے والی زوجہ کی طرح حیا کے ساتھ کام بھی کرتی ہیں۔

﴿فَجَآئَتۡهُ اِحۡدٰهُمَا تَمۡشِیۡ عَلَی اسۡتِحۡیَآءٍ﴾ (قصص: ۲۵)

''تو اُن دونوں عورتوں میں سے ایک عورت آئی حیا کے ساتھ چلتی ہوئی''۔

تو حیا دراصل نامحرم مرد اور عورت کے درمیان تعلق کا بنیادی تقاضہ ہے، معاملہ کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ایک حد بندی (distance) کے ساتھ معاملہ کرنا، ایک دوسرے کی ذات پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے صرف موضوع پر توجہ رکھنا، پورے اعتماد (confidence) کے ساتھ معاملہ کرنا ہے۔ بات چیت میں گھٹیا پن نہ ہو، لبھانے (flirtation) کا سا انداز نہ ہو۔

حیا کا تقاضا:

حیا کا آغاز سوچ سے ہوتا ہے، جذبات سے ہوتا ہے۔ پہلے یہ ارادہ کرلیں کہ ہمیں حیا کرنی ہے اور پھر اس کا اظہار جسم اور لباس وغیرہ سے ہوگا۔ صد افسوس کہ آج "TV" کے ڈراموں نے، فلموں نے، فحش ناولوں نے حیا کے احساس کو بالکل ختم کردیا۔ حیا ہمارے معاشرے سے ایسے اُٹھی کہ اب جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ انسان زبان پر نہیں لاسکتا۔ سورۃ الانعام میں ارشاد الٰہی ہے۔

﴿وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ﴾ (۱۵۱)

''تم بے حیائی کے قریب بھی مت جاؤ، نہ ظاہر نہ پوشیدہ۔''

تو یہ حیا کا تقاضا ہے کہ بندہ اخلاق باختہ مناظر نہ دیکھے، آنکھوں کو خیانت سے بچانا ہے، آنکھوں کا بھی پردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو دیکھنے سے منع فرما دیا ہے انسان اُن کو نہ دیکھے۔ نہ تنہائی میں بیٹھ کر کوئی ایسی چیز دیکھی جائے اور نہ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر۔ انسان یہ معیار بنا لے کہ جو چیزیں بچوں کے ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتے وہ تنہائی میں بھی بیٹھ کر نہیں دیکھیں گے، شوہر کے ساتھ بیٹھ کر بھی نہیں دیکھیں گے، اس لئے کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ انسان کے ضمیر کو تو پتہ ہے کہ یہ غلط کام ہے۔

جسم اور ذاتی معاملات کے بارے میں حیا:

اسی طرح اپنے جسم کے بارے میں حیا ضروری ہے۔ انسان کو محتاط رہنا چاہئے کہ جسم کہیں کھل نہ جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسًا يُّوَارِىۡ سَوۡاٰتِكُمۡ وَرِيۡشًا﴾ (۲۶)

"اے آدم کے بچو! ہم نے تمہارے لئے لباس نازل فرمایا ہے۔ جو تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانپنے والا ہے اور موجب زینت بھی۔"

تو ایسا لباس پہننا چاہئے جس میں جسم نمایاں نہ ہو، پورا ڈھک جائے، ساتر لباس ہو۔ تنہائی میں بھی انسان بے لباس نہ رہے۔ کسی بھی شرعی ضرورت کے بغیر جسم نہ کھولا جائے۔ یہ جسم کے بارے میں حیا کے احکام ہیں۔

معاملات میں حیا یہ ہے کہ جو معاملات تنہائی میں ہوتے ہیں جن میں کہ جسم کھلتا ہے اُن کا ذکر کسی کے سامنے نہ کیا جائے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مشہور صحابی تھے۔ اُن کا نکاح ہوا تو صبح کو بے تکلّف دوستوں نے پوچھا کہ رات کیسی گزری؟ اُنھوں نے نظر انداز کر دیا، جب دوستوں نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسی لئے دروازے اور تالے بنائے ہیں کہ جائز اور مباح کام بند دروازوں کے پیچھے ہو اور جب اُس کا ذکر کھلم کھلا شروع ہو جائے تو یہ چیز بے حیائی میں شامل ہو جاتی ہے۔" تو ازدواجی زندگی کے بارے میں گفتگو کرنا یا

چھیڑ چھاڑ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ یہ نہ تو خود اعتمادی کی علامت ہے کہ ہم اپنے راز کے معاملات بھی اوروں کے سامنے کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ اور نہ ہی یہ اپنائیت کی علامت ہے۔ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم دوستوں میں کوئی بات پوشیدہ (secret) نہیں ہے، ہم تو آپس میں ہر بات کرتے ہیں۔ یہ ذاتی (private) باتیں دوسروں کو بتانا مناسب نہیں ہے، نہ دوسروں کی ازدواجی زندگی کے بارے میں کھوج کرید کرنا چاہئے۔

حیا اور بے حیائی کی تاثیر:

اسی طرح حیا ہی انسان کو رواداری سکھاتی ہے، مروت اور لحاظ سکھاتی ہے۔ بڑوں بزرگوں کے سامنے انسان زبان درازی نہیں کرتا، بدتمیزی کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ حیا کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بڑے غلط بات بھی کہہ رہے ہوں تو ہمت نہیں ہوتی کہ اُن کو ٹوک دیں یا تصحیح کر دیں۔ گویا یہ کہ اُن کو ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے۔ شرم اور حیا رکاوٹ بن جاتی ہے اور زبان کے غلط استعمال سے انسان کو بچا لیتی ہے۔ بے حیائی کی وجہ سے چہرے کا نور چلا جاتا ہے۔ چہرے بے رونق ہو جاتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا تو حال یہ تھا کہ کوئی ناگوار بات بھی آپؐ کے سامنے ہوتی تو آپ ﷺ زبان سے نہیں کہتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں اگر کوئی چیز آپ ﷺ کو بُری لگتی تھی ہم آپ ﷺ کے چہرے سے پہچان جاتے تھے"۔ یعنی آپ ﷺ کی حتی الامکان کوشش ہوتی تھی کہ آپ ﷺ زبان سے تنقید نہ کریں، کسی چیز کو بُرا نہ کہیں۔

اس کے علاوہ بے باکی سے ہر چیز پر تبصرہ کرنا، تنقید شروع کر دینا، سب کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دینا یہ بھی حیا کی قِلّت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ غیبت کرنا، طنز و طعنہ کے ذریعے کسی کی عزت کو تار تار کر دینا، بے دھڑک کسی کا مذاق اُڑانا یہ سب بے حیائی کے مظاہر ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں

کہ حیا کا مطلب فقط ''پردہ'' ہے، بس چہرہ ڈھانپ (cover) لو تو حیا کا تقاضہ پورا ہو جائے گا۔ حالانکہ یہ حیا کا بس ایک حصّہ ہے، حیا کا کامل تصور نہیں ہے۔ تو معاملات سے، بات چیت کے انداز سے، حرکات وسکنات سے حیا چھلکنی چاہئے۔ انسان کے شقی اور بدبخت ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ '' قِلَّةُ الْحَيَا '' (lack of modesty) ہو۔ حیا زبان کے غلط استعمال سے بھی باز رکھتی ہے اور اس سے مروّت بھی پیدا ہوتی ہے۔ کسی کو خالی ہاتھ کیسے لوٹائیں، کوئی مدد طلب کرے تو کیسے مدد نہ کریں۔ دل چاہتا ہے آپ کے پاس سے کوئی خالی ہاتھ نہ لوٹے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بھی شان ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں مضمون آتا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ رَبَّكُمْ تَبَارَكَ وَتَعَالَى حَيِيٌّ كَرِيمٌ يَسْتَحْيِي مِنْ عَبْدِهِ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اِلَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا))[۱]

''بے شک تمھارے ربّ میں حیا اور کرم کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات سے شرماتا ہے کہ اس کا بندہ اُس کے آگے ہاتھ پھیلائے اور اللہ اُس کو خالی ہاتھ لوٹا دے۔''

بچوں کی تربیت میں حیا کا خاص خیال رکھا جائے:

اپنی اولاد کی تربیت میں حیا، رواداری اور مروّت کو نہ بھولیں۔ بچپن ہی سے زبان کے بارے میں بچوں کو محتاط کریں، لباس کے بارے میں محتاط کریں۔ چھوٹی عمروں میں بھی بچوں کو عریاں (revealing) کپڑے مت پہنائیں۔ یہ اکثر بیٹیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو بالکل گڑیوں کی طرح لگتی ہیں۔ بچیوں کو ضرور سجائیں، سنواریں، کلپ (clips) لگائیں، چوڑیاں پہنائیں، (hair bands)، ربن (ribbon)، فراک (frocks) جو جی چاہے پہنائیں، لیکن ایسا نہ ہو کہ وہ مغربی طرز کا ہو، بہت پتلا لباس، بہت تنگ لباس یا بغیر آستینوں (sleeveless) کے لباس وغیرہ سے گریز کریں۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب الدعاء

یہ اساتذہ کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں میں حیا کو پروان چڑھائیں، حیا کا تصور اجاگر کریں۔ والدین اور استاد دونوں کا یہ کام ہے۔ ترمذی اور مسندِ احمد میں حدیث مبارکہ ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ''نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((الْحَيَاءُ مِنْ الْإِيمَانِ وَالْإِيمَانُ فِي الْجَنَّةِ وَالْبَذَاءُ مِنْ الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِي النَّارِ))(۱)

''حیا ایمان کی ایک شاخ ہے اور ایمان کا مقام جنت ہے۔ اور بے حیائی بدکاری میں سے ہے۔ کوڑا کرکٹ ہے، بُری چیز ہے اور بدی آگ میں لے جانی والی ہے۔''

ایک حدیث مبارکہ ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لِكُلِّ دِينٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ))(۲)

''ہر دین کا کوئی امتیازی وصف ہوتا ہے اور اسلام کا امتیازی وصف حیا ہے۔''

ایک اور واقعہ بخاری اور مسلم میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ''نبی اکرم ﷺ کا گزر انصار میں سے ایک شخص پر ہوا اور وہ اس وقت اپنے بھائی کو شرمیلے پن کے بارے میں نصیحت اور ملامت کر رہا تھا۔ تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا:

((دَعْهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنْ الْإِيمَانِ))(۳)

''اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ حیا تو ایمان کا جز یا ایمان کا پھل ہے۔''

تو حیا اتنی اچھی چیز ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر و الصلة، باب ما جاء فی الحیاء

(۲) موطأ امام مالك، کتاب الجامع، باب ما جاء فی الحیاء

(۳) بخاری، کتاب الایمان، باب الحیاء من الایمان

((اَلْحَيَاءُ لَا يَأْتِي اِلَّا بِخَيْرٍ))(۱)

''حیاصرف خیر ہی کولاتی ہے۔''

صحیح بخاری میں ایک اور حدیث مبارکہ ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ اِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ))(۲)

''اگلی نبوت کی باتوں میں سے جو کچھ لوگوں نے پایا ہے اُس میں سے ایک مقولہ یہ بھی ہے کہ جب تم میں شرم اور حیا نہ ہو تو پھر جو چاہو کرو۔''

جب شرم نہ رہی، حیا نہ رہی ہو تو پھر جو مرضی کرو۔ پھر تمہیں کوئی بے حیائی کا کام بُرا نہیں لگے گا، عار محسوس نہیں ہوگی، سب کچھ کر گزرو گے یعنی جب حیا نہیں تو ایمان نہیں اور جب ایمان نہیں تو کونسی شے انسان کو گناہ سے روکے گی، اسی لیے حیا کو بہت زیادہ عام (promote) کرنے کی ضرورت ہے۔

دو چیزوں میں حیا نہیں:

اب دو چیزیں ایسی ہیں جن میں حیا نہیں ہونی چاہئے۔ علم سیکھنے میں اور اظہارِ حق میں۔ جہاں تک علم سیکھنے کا تعلق ہے تو ایک عربی کی مشہور کہاوت ہے کہ دو ''م'' والے علم حاصل نہیں کرسکتے، ایک ''مُتَكَبِّر''، یعنی تکبر کرنے والا اور دوسرا ''مُسْتَحْيٌ''، یعنی شرم کرنے والا۔ لہٰذا سیکھنے سکھانے میں حیا نہیں ہونی چاہئے۔ شرعی مسائل ہوں، پاکی ناپاکی کے مسائل ہوں، ان کو پوچھنے اور بتانے میں شرم نہیں کرنی چاہئے۔

دوسرے حق کے اظہار میں بھی شرمانے کی ضرورت نہیں کہ فلاں بُرا منالے گا۔ یہ رواداری نہیں ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب میں فرمایا ہے:

---

(۱) بخاری، کتاب الأدب، باب الحیاء

(۲) بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار

﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِ مِنَ الْحَقِّ﴾ (۵۳)

''اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا حق بیان کرنے سے''

تو حق بیان کر دینا چاہیے۔ پھر فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾(البقرة:٢٦)

''اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا اس بات سے کہ وہ مچھر کی مثال بیان کرے یا اس سے بھی کمتر چیز کی۔''

تو علم اور حق ان دو چیزوں میں شرمانا نہیں چاہیے۔ کوئی شخص کہے کہ ہمیں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے سے شرم آتی ہے۔ اس معاملے میں جھجک اچھی شے نہیں ہے۔

حیا حاصل کرنے کے لیے انسان کیا کرے؟ سب سے پہلے تو پوری روح کے ساتھ نماز پڑھے، نماز باحیا بنائے گی۔ جس طرح کا لباس ہم نماز میں پہنتے ہیں دیگر زندگی میں بھی ویسا ہی لباس پہننے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾(العنكبوت:٤٥)

''بے شک نماز تو روکتی ہے فحش سے اور منکر سے''

اور حیا حاصل کرنے کے لئے ایمان کا جو سرچشمہ ہے یعنی قرآن، اس سے انسان تعلق جوڑے۔ تو اللہ تعالیٰ سے بہت دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی عفت اور عصمت کی حفاظت کرنے والا، بنادے اور اللہ ہمارے اندر حیا پیدا کر دے۔ آمین

تنظیم اسلامی

67-A، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور، 54000
فون:36316638، 36366638، 36293939
ای میل:markaz@tanzeem.org www.tanzeem.org

مراکز حلقہ جات

	فون	موبائل	ای میل
مالاکنڈ	0945-601337	0345-9535797	timergara@tanzeem.org
پشاور	091-2262902	0333-9244709	peshawar@tanzeem.org
اسلام آباد	051-2841964	0333-5567111	islamabad@tanzeem.org
راولپنڈی	051-4866055	0333-5382262	rawalpindi@tanzeem.org
مظفر آباد	0992-504869	0300-7879787	muzaffarabad@tanzeem.org
گوجر خان	051-3516574	0321-5564042	gujjarkhan@tanzeem.org
گوجرانوالہ	055-3891695	0300-7446250	gujranwala@tanzeem.org
گلبرگ لاہور	042-35845090	0300-4708607	lahoreeast@tanzeem.org
سمن آباد لاہور	042-37520902	0323-8269336	lahorewest@tanzeem.org
عارف والا	0457-830884	0300-4120723	arifwala@tanzeem.org
فیصل آباد	041-2624290	0321-6676695	faisalabad@tanzeem.org
سرگودھا	048-3713835	0300-9603577	sargodha@tanzeem.org
ملتان	061-6520451	0321-6313031	multan@tanzeem.org
سکھر	071-5631074	0345-5255100	sukkur@tanzeem.org
حیدر آباد	022-2106187	0333-2608043	hyderabad@tanzeem.org
یاسین آباد کراچی	021-34816580	0345-2789591	karachinorth@tanzeem.org
سوسائٹی کراچی	021-34306041	0333-3503446	karachisouth@tanzeem.org
کوئٹہ	081-2842969	0346-8300216	quetta@tanzeem.org